

علّامہ مولانا محمد علی لاہوری
عصر حاضر کا پیشرو مفسّر قرآن

(ایک تاریخی اور تحقیقی جائزہ)

تالیف و پیشکش

ابوالکمال محمد شارق

(مترجم قرآن بزبان ہندی)

﴿جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں﴾

کتاب کا نام : علامہ مولانا محمد علی لاہوری
 عصر حاضر کا پیشہ و مفسر قرآن
 (ایک تاریخی اور تحقیقی جائزہ)

مصنف : ڈاکٹر خورشید عالم ترین

سن اشاعت : ۲۰۱۹ء

ناشر : اے۔ اے۔ آئی۔ آئی۔ ہند
 پاکٹ 'ایل، جنت فلیٹس 25/A
 گراونڈ فلور ، دشاوگارڈن ،
 نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۹۵

عرض حال

حضرت مولانا محمد علی لاہوریؒ (وفات 1951ء) کامائی ناز اور مقبول عام انگریزی ترجمہ قرآن بمع تفسیری حواشی ولایت میں چھپ کر 1917ء میں منتشر ہو د پر آیا۔ تب سے اب تک اپنی شان برقرار رکھے ہوئے ہے۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب نے اپنی وفات سے پہلے اس پر نظر ثانی بھی فرمائی تھی، آج کل یہی نظر ثانی شدہ ایڈیشن دستیاب ہے۔

اردو زبان میں مولانا موصوف کام مشہور زمانہ اور نادر تفسیری شاہکار اُردو تفسیر ”بیان القرآن“ ہے۔ یہ تفسیر تین جلدیوں میں بڑی آب و تاب کے ساتھ لاہور سے (1922ء تا 1924ء) شائع ہوئی۔ کتابت کے لئے اُس دور کے نامور خطاط مولوی عبدال قادر خوشنویس کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس خطاطی نے مولانا آزاد کو بھی مسحور کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سورہ فاتحہ کی تفسیر ”اُم القرآن“ کے لئے خاص طور پر اسی کا تب کو منگوایا تھا (خطوط ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ مالک رام۔ ص ۲۱۱)۔ تقسیم ہند کے بعد تفسیر بیان القرآن کو از سر نواز زیادہ عمدہ کتابت کے ساتھ آفیٹ پر چھپا پا گیا۔ پہلے کی نسبت کاغذ باریک ہونے کے سبب جنم و جلدیوں میں سمٹ گیا۔ اس کا ایک نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب خصوصی ایڈیشن امریکہ سے شائع ہوا ہے۔ الیکٹرانک ٹائپ سینگ میسر آجانے سے انشاء اللہ عنقریب اور زیادہ باریک کاغذ یعنی بابل پیپر پر ایک ہی جلد میں دستیاب ہو جائے گی۔ انگریزی اور اردو دونوں ہی تفسیروں کے اب تک متعدد ایڈیشن چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ **فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكِ!**

محترم ایج۔ امیر علی صاحب نے اپنی مشہور تالیف ”دی سٹوڈیس قرآن“ کی ابتداء میں انگریزی زبان میں شائع شدہ تراجم قرآنی کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ جس میں حضرت مولانا محمد علی لاہوریؒ کی انگریزی تفسیر کے بارے میں یوں لکھا ہے :

”مولانا محمد علی صاحب کی انگریزی تفسیر قرآن دُنیا کی وہ پہلی تفسیر ہے جو

ایک ایسے مسلمان کے ہاتھوں انجام پائی جس میں قرآن دانی اور قرآن کی ترجیحی
کی پوری صلاحیت اور استعداد موجود ہے۔ اس تفسیر نے دورِ جدید کی عالی پایہ
مطبوعات کے سارے معیار اور تقاضے پورے کر دیئے ہیں۔“

("The Student's Qur'an", page iv)

مُؤرخ اسلام علامہ ڈاکٹر محمد اکرم لکھتے ہیں:

”مولانا محمد علی امیر جماعت (احمد یہ لاہور) کا ترجمہ تفسیر قرآن انگریزی
زبان میں پہلا ترجمہ تھا جو کسی مسلمان کے ہاتھوں پر انجام پایا۔..... آج کلام مجید
کے متعدد انگریزی ترجمے شائع ہو رہے ہیں لیکن شرف اولیت مولانا محمد علی ہی کو
ہے۔ اور گذشتہ ربع صدی میں انگریزی خوان طبقے کو قرآن سے زیادہ دلچسپی
پیدا ہوئی ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب مولانا محمد علی کا ”ترجمۃ القرآن“ ہے۔ آج
مولانا ابوالکلام آزاد (وفات 1957ء) نے مطالب قرآنی کو واضح کرنے کا
جو طریقہ اختیار کیا ہے، اسکا نمونہ مولوی محمد علی نے اب سے چھپیں سال پہلے پیش
کر دیا تھا۔“ (موج کوثر۔ ص 105۔ طبع اول۔ ناشر تاج گمپنی لاہور)

یا کیلئے مولانا آزاد مر حوم کی بات نہیں۔ ما بعد کے سبھی روشن خیال مترجمین و مفسرین نے کسی
نہ کسی رنگ میں مولانا محمد علی کی ضرور اتباع کی ہے۔ مولانا موصوف کے سوانح نگاروں نے
اردو تفسیر ”بیان القرآن“ کی مقبولیت اور افادیت کے بارے میں لکھا ہے:

”اس تفسیر کی مقبولیت اور افادیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ بڑے بڑے
غیر احمدی اور مخالف مولوی صاحبان بھی اس کو درس قرآن دینے کے لئے استعمال کرتے
رہے ہیں۔ بہت سے احباب نے مشاہدہ کیا ہے کہ خود مکہ مظہمہ اور مدینہ منورہ میں اس
تفسیر سے درس دیا جاتا رہا ہے۔ اور اس کے بعض حصوں کے عربی تراجم بھی ہوئے
ہیں۔ اور یہ بات بھی مشاہدہ میں آچکی ہے کہ بعض مخالف مولوی صاحبان، جو کسی مصلحت

کی بنا پر احمدیوں کو کافر کہنے پر مجبور ہیں، اس تفسیر کے سرورق کو علیحدہ کر کے (جس پر مولانا محمد علی اور احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کا نام ہے) باقی کی کتاب اپنے سامنے درس قرآن دیتے وقت رکھتے رہے ہیں۔“

(مجاہد کبیر۔ ص ۱۵۵۔ طبع ۱۹۶۲ء۔ نشر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور)

بر صغیر ہندوپاک کے نامور رائخ العقیدہ مفسر و مفکر، صاحب قلم وجید عالم دین مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی (وفات ۱۹۷۷ء) اپنا ذاتی معاملہ پیش کرتے ہوئے قطر از ہیں:

”مولانا محمد علی صاحب نے قرآن کا انگریزی ترجمہ کر کے اسلام کی جو ہتھیم بالشان خدمت سرانجام دی ہے۔ اس کا اعتراف نہ کرنا سورج کی روشنی سے انکار کرنا ہے۔ اس ترجمہ کی بدولت نہ صرف ہزاروں غیر مسلموں نے اسلام کے دامن میں پناہی، بلکہ ہزاروں مسلمان بھی اسلام کے زیادہ قریب آگئے۔ جہاں تک میر اعلان ہے۔ میں نہایت مسرت سے اعتراف کرتا ہوں کہ یہ ترجمہ ان چند کتابوں میں سے ہے جو چودہ بدرہ سال پہلے، جب میں خلمتوں اور دہریت کی گہرائیوں میں بھٹک رہا تھا، میرے لئے شمع ہدایت بن کر آئیں۔ اور مجھے اسلام کا سیدھا راستہ سمجھایا۔ کامریڈ اخبار والے مولانا محمد علی (جوہر) مرحوم بھی اس ترجمہ کے بہت شائق تھے اور وہ ہمیشہ اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔“

(اخبار ”صحیح“ 25 جون 1932ء)

اللہ کی شان! دہریت کی گہرائیوں سے ابھر کر باہر آنے والا یہ شخص آگے چل کر خود بھی مفسر قرآن بن گیا۔ علمی اور دینی حلقوں میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی اردو اور انگریزی تفسیریں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ مولانا دریابادی حضرت مولانا محمد علی کی لاثانی، بلند پایہ اور غیر معمولی اردو تفسیر (بیان القرآن) کے متعلق یہ تاریخی رویارک بطور یادگار پیچھے چھوڑ گئے ہیں :

”سب سے بڑھ کر ان کی (یعنی مولانا محمد علی لاہوری کی) اردو تفسیر“ بیان القرآن، تین جلدیوں میں بحثیت مجموعی بڑی قابل قدر ہے۔ اسلام اور قرآن کی حقانیت کا نقش دل پر ثبت کر دینے والی۔“ (معاصرین۔ ص 43 تا 44 طبع اول)

یہ مولانا دریابادی کی اپنی وفات سے صرف دو تین برس پہلے کی رائے ہے۔ اس تاریخی جملے میں مولانا دریابادی نے صحیح دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ قرآن پاک کی صحیح ترجمانی اور حقیقی تفسیر کا اس سے بہتر الفاظ میں تعارف ممکن نہیں، کہ وہ :

”اسلام اور قرآن کی حقانیت کا نقش قاری کے دل بر ثبت کر دے۔“

مولانا شناع اللہ صاحب امرتسری نے سن ۱۹۳۲ء میں پادری سلطان محمد پال کے قرآن کریم پر اعتراضات کا جواب ”برہان التفاسیر“ کے عنوان سے اپنے اخبار ”المحمدیث“ میں شائع کیا تھا، جس کو اب کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا ہے۔ اس میں صفحہ ۲۱۹ تا ۲۲۰ پر مولانا محمد علی لاہوری کی مایہنا تفسیر ”بیان القرآن“ کا یہ اقتباس درج کیا گیا ہے:

”قرآن شریف عربی تصنیف میں ایک بے نظیر کتاب ہے اور ہمیشہ عربی زبان کی فصاحت کا معیار مانا گیا ہے۔ لیکن اس پاک کتاب کی بڑی خصوصیت جس میں کوئی دوسری کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اس کی وہ عجیب کاپلٹ کرنے والی طاقت ہے جو اس کے کام سے ظاہر ہوئی۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کی مدعی خود یہ پاک کتاب اپنے آغاز ہی میں ہے۔ یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں یہ ہدایت ہے متقیوں کے لئے۔“

احمدیت کا کم مخالف ہونے کے باوجود مولانا موصوف نے اس پر یہ ریمارک رقم فرمایا :

”مولوی محمد علی صاحب نے جو قرآن مجید کی کشش کا ذکر کیا ہے سونے سے لکھنے کے قابل ہے۔“

ہم بھی اس عرض داشت کو اسی تاریخی جملے پر ختم کرتے ہیں۔ زیر نظر کتاب کی تیاری کے لئے مواد تنازیادہ و سبع اور تنوع تھا کہ سمینا خاص مشکل ہو گیا۔ بہت سے پہلو تشنہ ہی رہ گئے۔ اللہ نے چاہا تو اگلے ایڈیشن میں تلافلی کر دی جائے گی۔ والسلام۔

احقر العباد

خورشید عالم ترین

فہرست مضمون

عرض حال	3
ابتدائیہ	11
● زمانہ کی نیرنگیاں	11
● حق چھپ تو سکتا ہے مٹ نہیں سکتا۔	12
حضرت مولانا محمد علیؒ کی انگریزی تفسیر و ترجمہ قرآن اور قرآن کی انگریزی تفسیر اور اردو تفسیر شائع کرنے سے پہلے	20
حضرت مولانا محمد علیؒ کی انگریزی تفسیر و ترجمہ قرآن اور اُردو، بیان القرآن، کاشاند ار استقبال	26
تاریخ عالم کا ناقابل فراموش اور یادگار واقعہ	26
مولانا محمد علی جوہر کی دلی تمنا	29
ہندوستان کی جنگ آزادی میں مولانا محمد علی لاہوری کی انگریزی تفسیر کا رول	31
مولانا محمد علی لاہوری کا تاریخ مہاتما گاندھی کے نام	35
مہاتما گاندھی کا جواب	36
قائد اعظم محمد علی جناح	36
درس قرآن میں مولانا محمد علی کی تفسیر سے استفادہ	39
قدامت پسند علماء کی مخالفت اور بے بنیاد پر اپیلینڈا	41

نامور اکاابر علماء کی آراء

● مولانا عبدالمadjدر یا آبادی	49.....
● الحاج حافظ غلام سرور	50.....
● امرتسر کے معتبر اور مشہور اخبار و کیل کا تبصرہ	51.....
● مولانا عثمان غنی طاہر	52.....
● مصر کے علامہ شکیب ارسلان	53.....
● مدیر رسالہ انجمن حمایت اسلام لاہور	54.....
● ڈاکٹر اسرار احمد	54
● مولانا عبدالجید خان مدیر رسالہ ”مولوی“	55.....
● مولانا رحمت اللہ طارق	55.....
● ایک اور مثال	58.....

حضرت مولانا محمد علی صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن مع تفسیر اور اُردو تفسیر بیان القرآن، بحیثیت دوپیش رو تفسیریں

● علامہ یوسف علی	60.....
● الحاج حافظ غلام سرور	60
● مولانا محمد مارماڈیوک پکتھاں	61
● مولانا مرزا ابوالفضل	62.....
● امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد	64
● ذوالقرنین کی تاریخی تحقیق	65.....

• حضرت ابراہیم اور پرندے 65
• اصحاب کھف کون تھے 67
• حضرت ابراہیم اور تین جھوٹ 70
• جھوٹ نمبر 1 پر مولانا محمد علی کا تبصرہ 72
• جھوٹ نمبر 2,3 پر مولانا محمد علی کا تبصرہ 73
• مولانا آزاد کی رائے 74
• جہور کا خوف اور ذہنی الفاظ کا استعمال 76
• وفات مسح 77
• حضرت سلیمان اور ہوا 80
• آیات قرآنی کے ترجمہ میں پوری احتیاط 84

مفسر قرآن سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن --- 111 - 89

ایران کے شیعہ مفسر قرآن

جناب زین العابدین رہنماء 112

ما بعد کی مفسرین پر حضرت مولانا محمد علی صاحب کا اثر --- 134-118

بیان القرآن

(پچھے دمیع المثال شہ پارے)

- | | |
|--|-----|
| (۱) سورة الفاتحہ کی عظمت | 137 |
| (۲) منعم علیہم کون ہیں؟ | 139 |
| (۳) اللہ یستھنی بہم (البقرہ : ۱۵) کی تشریع | 141 |
| (۴) بنی اسرائیل کا بندر بننا | 143 |
| (۵) ابن مریم نام کی وجہ | 144 |
| (۶) غداوں کا اثر اخلاق پر | 147 |
| (۷) شراب اور جوا | 148 |
| (۸) عورت کی گواہی | 151 |
| (۹) حضرت مریم کا ملنے والا رزق | 152 |
| (۱۰) بن یامین کی بوری میں پیالہ حضرت یوسف نے نہیں رکھا | 156 |
| (۱۱) حضرت سلیمان اور انکے عصا کو دیک کے کھانے کا قصہ | 158 |
| (۱۲) آیت خاتم النبیین کی تشریع | 159 |
| (۱۳) سورة الاخلاص | 164 |

ابتدائیہ

مولانا محمد علی لاہوری کی عظیم شخصیت اور انکی بے مثال خدمات اسلام

(اک مختصر تعارف)

ایک زمانہ وہ تھا جب انصاف پر وار خدا ترس علماء کھلے عام اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ: ”مولانا محمد علی ایم اے۔ ایل، ایل پی (امیر جماعت احمدیہ لاہور) ۔۔۔۔۔ نے اپنی طویل تصنیفی زندگی میں اپنے قلم کے ذریعہ جو خدمات اسلام کی انجام دیں وہ اپنی حلقہ پر بنے مثل وے مثال ہیں۔ انگریزی خوانوں بلکہ انگریزیت زدہ اردو خوانوں کے بھی حق میں ان کا قلم ایک نعمتِ عظمی تھا۔ خدا جانے لئنوں کے ایمان انہوں نے قائم کر دیئے۔ اور بورپ اور امریکہ وغیرہ کے کتنے ہٹکے ہوؤں کو انہوں نے اسلام کی راہ دکھائی۔“

(مشہور عالم دین اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد در پایا وی ایڈیٹر صدق چدپر)

”کسی زندہ انسان نے اسلام کی تجدید اور نشاد خانیہ کے لئے لاہور کے مولانا محمد علی صاحب سے زیادہ فقیتی اور طویل خدمات انجام نہیں دیں۔ ان کے تصنیفی کارناموں کی وجہ سے تحریک احمدیت ایک خاص شہرت اور امتا زکی ماں کے بن گئی۔“

(قرآن یاک کامشہپور انگریز نو مسلم مترجم، جناب محمد مارماڈی بوک پکتھال)

اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ علماء ایک خاص مقصد کے پیش نظر مسلمانوں کی نئی نسل کو اسلام کے اس عظیم الشان حامی اور خادم ہے بدل کی خصیت اور اسکی بے مثل و مثال خدمات دینیہ سے بکھر انہیں اور بے خبر رکھنا چاہتے ہیں۔ وجہ ڈھونڈنا کوئی مشکل کام نہیں کیونکہ آج علماء جن جدید اور ترقی یافتہ دینی افکار کو اپنی میراث و ملکیت مانتے ہیں، ان کا اصل سرچشمہ احمد یہ علم الكلام ہی ہے۔ اس جدید علمی سرمایہ کے مأخذ کی نشاندہی علماء کی شان و وجہت کے لئے فقصان دہ ہے۔ اور ایسا کرنے

سے ان کے پاس تکفیر و مخالفت کا جواز بھی باقی نہیں رہتا۔

حق چوب تو سکتا ہے مرت نہیں سکتا

کسی نے کیا خوب کہا ہے: ”حق کو طاقت کے زور پر کچھ دیر کے لئے چھپایا دبایا تو جا سکتا ہے لیکن مٹایا ہرگز نہیں جا سکتا۔“ پاکستانی علماء نے حکومت وقت سے ملک احمدیت کو مٹانے اور اس کی ترویج و اشاعت کو روکنے کے لئے ہر ممکن حرہ باستعمال کیا۔ مسلمانوں کی نئی نسل کو احمدی مسلمانوں سے ملنے اور ان کا لظر پھر پڑھنے سے زبردستی روک دیا گیا اور دوسرا طرف احمدیوں سے یہ بنیادی حق بھی چھین لیا کہ وہ عدالت میں جا کر اپنی بے گناہی ثابت کریں۔ لیکن پاکستانی علماء یا ان کی نافذ حکومت اللہ تبارک و تعالیٰ کو جو حکم المکین ہے، اپنا فیصلہ سنانے سے روک نہیں سکتے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا طاق تو رغبی ہاتھ اندر ہی اندر کام کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ deensearchcenter.com کا یہ غیر جانبدار نہ اور منصفانہ بیان پاکستان کے تنگ نظر علماء اور غیر منصف حکومت کی زیادتوں اور نافذوں کا پردہ فاش کرنے کے لئے کافی ہے:

THE HOLY QURAN

Maulana Muhammad Ali

Muhammad Ali's understanding of the Qur'an is a must-read for everybody. His universal and inclusive approach, and his use of classical as well as modern 'Tafsir' (especially Sayyid Ahmad Khan), makes this one of the best rational and honest commentaries on the Qur'an. Being form Lahori Ahmadiyya, which is not dogmatic sectarian as the Qadani counterpart, has been wrongfully labeled as heretical. His innovating insights show the progress of Muslim thought in the 20th century.

ترجمہ: ”مولانا محمد علی صاحب کی بلند پایہ قرآنی بصیرت کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ کاس کامطالعہ ہر شخص کے لئے (عامی ہو یا خاص) ازبس ضروری ہے۔ مولانا موصوف کی عالمگیر اپروچ (approach) نے، نیز تفسیر کی تیاری میں مستند تفاسیر قدیمه کے ساتھ ساتھ تفاسیر جدیدہ (خاص کر سید احمد خان صاحب کی تفسیر) سے استفادہ، ان تمام خوبیوں نے مولانا محمد علی کی تفسیر کو قرآن پاک کی ان اعلیٰ ترین تفسیروں

میں شامل کر دیا ہے جو اپنی روشن خیالی اور ایماندارانہ نجح کے لئے مشہور ہیں۔ مولانا موصوف کا تعلق احمدیوں کی لاہوری شاخ سے ہے۔ جو اپنے دوسرے فریق یعنی قادریانی جماعت کی طرح کٹر فرقہ پرست نہیں۔ بدشتمی سے مولانا موصوف کو بھی کافر قرار دے دیا گیا ہے، جو بات سراسر غلط اور حق سے دور ہے۔ 20 ویں صدی کے ترقی یافتہ افکار اسلامیہ کی جدّت مولانا محمد علی کے افکار عالیہ ہی کی دین ہے۔“

www.al-hidaayah.co.uk
تالیف (An Introducton to the Sciences of the Qur'aan) یعنی "مقدمہ علوم القرآن" نیٹ پر ڈالی ہے۔ اس میں "English translations by Muslims" عنوان کے تحت صاف اعتراف موجود ہے:

"مولانا محمد علی صاحب (لاہوری) کا انگریزی ترجمۃ القرآن سن ۱۹۱۶ء میں منظر شہود پر آیا۔ قادریانی (احمدی) مکتبہ خیال سے وابستہ ہونے کے باوجود یہ ترجمہ ما بعد کے متعدد دجالے مانے انگریزی تراجم پر اپنی چھاپ اور اثر ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ خصوصاً مولانا محمد مارماڈیوک پکھاں، علامہ یوسف علی، حافظ غلام سرور، مولانا عبدالmajid ریاضی اور شاکر صاحب کے تراجم پر۔" (صفحہ ۳۵۹)

یہی اعتراف عصر حاضر کے مشہور مسلمان تاریخ دان ڈاکٹر شیخ محمد اکرم (ایم، اے، پی، ایچ ڈی) نے یوں کیا ہے:

"لاہوری جماعت مرزا صاحب کی معتقد ہے لیکن اُس کے ساتھ ساتھ وہ حتی الوضع اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے وابستہ رکھنا اور ان کے ذکر سکھ میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہے۔ لاہوری احمدی غیر احمدیوں کو فرنہیں کہتے۔ مرزا صاحب کی نبوت کے قائل نہیں، بلکہ انہیں حضرت مجدد الف ثانی اور دوسرے بزرگوں کی طرح ایک مجدد مانتے ہیں۔ لاہوری جماعت احمدیہ کا نظم و نسق انجمن اشاعت اسلام لاہور کے ہاتھ میں ہے۔ مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی جنہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مذہب کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی اس کے صدر ہیں....."

ایک اہم کام جو یہ جماعت کر رہی ہے، قرآن مجید کی اشاعت ہے۔ بالخصوص انگریزی میں۔ مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ کا ترجمہ و تفسیر قرآن انگریزی زبان میں پہلا ترجمہ تھا، جو کسی مسلمان کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ ترجمے کے علاوہ آپ نے کلام مجید کی مختلف سورتوں کی تقسیم و ترتیب کر کے اور ان کے مضامین کا خلاصہ دے کر مطالب قرآن کو واضح کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ صرف الفاظ پر ہی توجہ نہ رہے بلکہ کلام مجید کے ارشادات اور خیالات بھی وضاحت سے ذہن نشین ہو جائیں۔

آج کل کلام مجید کے متعدد انگریزی ترجمے ہو رہے ہیں۔ لیکن شرف اولیت مولانا محمد علی کے ترجمہ ہی کو ہے۔ اور گذشتہ ربع صدی میں انگریزی خواں طبقے کو قرآن سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب مولانا محمد علی کا ”ترجمہ القرآن“ ہے۔ آج مولانا ابوالکلام آزاد نے مطالب قرآنی کو واضح کرنے کیلئے جو طریقہ اختیار کیا ہے۔ اُس کا نمونہ مولوی محمد علی نے اب سے پہلے پیش کر دیا تھا۔

(موج کوثر، ص 105، طبع اول، مطبوعاتیج کمپنی)

”موج کوثر“ کے دوسرے ایڈیشن میں مولانا آزاد والاجملہ حذف کر دیا گیا ہے۔ یقیناً ایسا علماء کے دباؤ میں آ کر رہی کیا گیا ہوگا۔ کیونکہ علماء کے دباؤ یا ہمگی کی جھلک آگے صاف دکھائی دیتی ہے، جہاں اپنے بچاؤ کیلئے مولانا عبدالمadjد ریابادی مرحوم کی ایک متذبذب اور غیر معقول سی عبارت کو ڈھال بنا کر پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اکرم لکھتے ہیں :

”مولانا عبدالمadjد ریابادی اس ترجمے کی نسبت لکھتے ہیں:

” غالباً ۱۹۲۰ء تھا کہ ایک عزیز کے پاس مولوی محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمۃ القرآن پڑھنے میں آیا اور طبیعت نے اُس سے بھی بہت گہرا اور اچھا اثر قبول کیا۔ مغربی راہ سے آئے ہوئے میوسوں شبہات و اعتراضات اس ترجمہ تفسیر سے دور ہو گئے۔ اور یہ رائے اب تک قائم ہے۔ اس میں سال کے عرصے

میں خامیاں اور غلطیاں بہت سی (بلکہ بعض جگہ تو ایسی جسارتیں جن کے ڈانڈے تحریف سے مل جاتے ہیں) اس ترجمہ و تفسیر کی علم میں آچکیں۔ لیکن انگریزی خوانوں اور مغرب زدؤں کے حق میں اس کے مفید اور بہت مفید ہونے میں ذرا بھی کلام نہیں۔ ہدایت کا واسطہ جب اللہ کی حکمت صریح غیر مسلموں کے کلام کو بنادیتی ہے تو یہ تو بہر حال اللہ کے کلام کا ترجمہ و حاشیہ ہے۔ مترجم کی بعض اعتمادی غلطیوں کی بنا پر ان کی ساری کوششوں سے بذلن ہو جانا قرین انصاف و متقاضے تحقیق نہیں۔“ (موج کوثر، طبع ثانی۔ ص 181 تا 182)

اب جو چیز دل کی گہرائیوں کو چھو کر اپنا اچھا اڑا لے، شہزادت و اعتراضات کو دور کرنے میں کارگر ہو، انگریزی خوانوں اور مغرب زدہ حضرات کے لئے مفید تر بھی ہو، سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسی کے بارے میں غلط یا نادرست ہونے کا فیصلہ کیسے دیا جاسکتا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ ایسی رائے قدامت پسند معاصر علماء کے غرض و غضب کو کم کرنے یا مخالفت سے بچنے کے لئے ہی تحریر کی گئی ہے۔ کیونکہ اس بیان میں ایک نہیں بلکہ متعدد متعارض و متناقض باتیں کہی گئی ہیں۔ بات دراصل اتنی ہی ہے کہ ہمارے علماء کرام قدیم تفاسیر یا اپنے کسی مروج نظریہ یا عقیدہ کے خلاف کچھ سننا ہی نہیں چاہتے۔ چاہے ان کا یہ عقیدہ، رائے یا نظریہ قرآن، حدیث، تاریخ یا عقل سليم کے کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو۔ سادہ سے سادہ معاملے کو بھی خواہ مخواہ پیچیدہ یا پھر خرق عادت بنا دینا گویا ان کی گھٹی میں ہے۔ ایک معمولی سی مثال امام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی کا مسئلہ ہے۔ مخالفین اسلام اس معاملے کو آج بھی کافی سے زیادہ اچھال دے رہے ہیں۔ امام بخاریؓ نے راوی کے کہنے پر یہ لکھ دیا ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال اور خصتی کے وقت فقط نوسال تھی۔ اب کیا تھا ہمارے قدامت پسند علمائے کرام کے لئے یہی بات اللہ کا فرمان، اور پھر کی لکیر بن گئی۔ اس پر غور و فکر کرنا یا صحت و صداقت کو از سرنو جانچنا دین میں کھلی مداخلت یعنی ایک سگین جرم ہو گیا۔ حالانکہ قرآن کریم جگہ جگہ قاری کو اپنے مندرجات (یعنی کلام اللہ) پر کھلے غور و فکر اور کامل تدبیر کی دعوت عام دیتا ہے۔ لیکن ہمارے علماء امام بخاریؓ اور اور ان کے راوی کو معصوم عن الخطأ سمجھ کر ہر طرح کی تقدیم یا اختلاف سے

بالا قرار دیتے ہیں۔ اور یک زبان ہو کر یہی کہتے کہ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔ کیونکہ عرب گرم علاقہ ہے وہاں لڑکیاں کم سنی ہی میں بلوغت کو پہنچ جاتی ہیں۔ اس پرسوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا اب کیوں نہیں ہوتا۔ عرب لڑکیاں بھی عام لڑکیوں کی طرح ایک خاص عمر کو پہنچ کر ہی بالغ تسلیم کی جاتی ہیں۔ جو کسی بھی صورت میں ۹ سال نہیں ہو سکتی۔ اس لئے جب اصل واقعات کی از سرنو چجان ہیں کر کے حضرت مولانا محمد علی صاحب نے تاریخی اور عقلی دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ رخصتی کے وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ بھی طور ۹ سال کی کم سن پنجی نہ تھیں بلکہ پورے طور بالغ ہو پہنچی تھیں۔ تو اس تحقیق جدید کو دیکھ کر نام نہاد مولوی صاحبان کے ساتھ ساتھ قدامت پسند علماء بھی ناراض ہو گئے۔ رسالوں اور اخباروں میں مولانا محمد علی لاہوریؒ کے خلاف ایک باقاعدہ جنگ چھڑگی۔ معز کہ آرائی کرنے والوں میں مشہور سیرت نگار مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم بھی تھے۔ وہ یہ بات بھول گئے کہ نو سال کی کم سن پنجی سے مباشرت ثابت کر کے وہ حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبی ﷺ فداہ امی وابی کے اعلیٰ ترین کریم کرو جسے ”وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ“ (سورۃ القلم۔ آیہ ۳۲) کی آسمانی سند حاصل ہے، مخالفین اسلام میں ہیٹا اور محل اعتراض بنارہے ہیں۔ بد قسمتی سے مولانا سید سلیمان ندوی کے نزدیک حضرت امام بخاریؓ کا بیان قرآنی و تحریک سے کسی بھی طرح کم نہ تھا۔ اس لئے وہ اس کے خلاف ایک بھی دلیل سننے کو تیار نہ تھے۔ پر کتنی عجیب بات ہے کہ بے خیال میں سید صاحب موصوف خود بھی تاریخی دلائل و شواہد کی بنیاد پر بالکل وہی بات کہہ رہے تھے جو مولانا محمد علی صاحب نے پیش کی تھی۔ لیکن میں نہ ماںوں کی مقلدانہ ہٹ نے انہیں اصل حقیقت سے ہمکنار ہونے نہ دیا۔ اور اوقایت اور تحقیق کا سہرا حضرت مولانا محمد علی لاہوریؒ کے سرہی بندھ گیا۔ بخاری شریف میں آمدہ روایت کی صحت یا عدم صحت کو قطع نظر کرتے ہوئے اگر ہم صرف مندرجہ ذیل تاریخی نکتے پر ہی غور کریں تو معاملہ خود بخود حل ہو جاتا ہے :

”امیر معاویہؓ کی خلافت کا آخری حصہ حضرت عائشہؓ کی زندگی کا آخری زمانہ ہے۔ اس وقت ان کی عمر سڑھ برس کی تھی۔“ (سیرت عائشہ ص ۱۵۳)

”حضرت عائشہؓ بیوہ تھیں اور اس عالم میں انہوں نے زندگی کے چالیس مرحلے طے کئے۔“ (سیرت عائشہ ص ۱۱۱)

مطلوب یہ کہ حضرت نبی کریم ﷺ کی وفات (۱۱ ہجری) کے وقت حضرت عائشہؓ ۲۷ برس کی تھیں۔ کاشانہ نبوت میں اُن کا قیام ۹ سال رہا، کیونکہ رخصتی سن ۲ ہجری میں ہوئی تھی۔ اب معاملہ بنائیں اپنے بھی کے ایک دم صاف ہے کہ رخصتی کے وقت وہ کم سے کم ۱۸ سال کی بالغ تھیں، نو سال کی کم سن بھی ہرگز نہ تھیں۔ یہ بات دوسرے تاریخی قرآن و شواہد سے بھی میل کھاتی ہے۔ تاریخ ہمیں حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ کا سن وفات ۳۷ ہجری بتاتی ہے۔ اس وقت حضرت اسماءؓ کی عمر ۱۰۰ سال تھی۔ حضرت اسماءؓ حضرت عائشہؓ سے دس سال بڑی تھیں۔ سن ۲ ہجری میں آپ ۲۹ برس کی تھیں اس اعتبار سے بھی حضرت عائشہؓ دس سال کم یعنی ۱۹ سال کی تھیں۔ پس اس میں منہ پھلانے یا بگڑنے والی بالکل کوئی بات نہ تھی۔ امام بخاریؓ نے بھی کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کی فراہم کردہ ہر روایت قرآنی وحی کی مانند سو فیصد صحیح وائل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاملاک شکر ہے کہ اس معاملہ میں بھی اب دُنیاۓ اسلام نے حضرت مولانا محمد علی کے نظریے ہی کو صحیح تسلیم کر لیا ہے۔ ثبوت کے لئے اثربنیط کو دیکھا جاسکتا ہے۔

اب رہتی اختلاف رائے والے مسئلے کی اصل حقیقت (جسے بدستمی سے معنوی تحریف سمجھ لیا گیا ہے) تو اُس کو قرآن پاک کے مشہور انگریزی مترجم مولانا حافظ غلام سرور صاحب نے نہایت عالمانہ ڈھنگ سے زیر بحث لایا ہے۔ اور اصل صورت حال سب کے سامنے واشگاف کر دی ہے۔ مولانا غلام سرور اپنے انگریزی ترجمۃ القرآن کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

”مولانا محمد علی صاحب نے سابقہ مترجموں کی بیسیوں غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔ اور جہاں بھی انہوں نے اختلاف کیا ہے وہاں ان کا ترجمہ یا تو بالکل درست صحیح ہے یا ان کے ترجمہ کی بنیاد و اساس عربی زبان کی مستندگات پر ہے۔ ہمارے اس بیان سے کوئی یہ نتیجہ اخذ نہ کر لے کہ مولانا محمد علی نے (نحو ذ باللہ) قرآنی الفاظ کو نئے معنی پہنادیے ہیں۔ اگر قاری عجلت اور جلد بازی سے کام نہ لے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ مولانا موصوف ایک بلند پایہ عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم محقق بھی ہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ مولانا موصوف کے بعض حواشی میں ندرت یا نیا پن موجود نہیں۔ لیکن یہ کوئی نقص یا عیب والی بات نہیں۔ کوئی بھی شخص جو قرآن پاک کی ترجمانی

میں کامل دیانتداری اور اخلاص سے کام لے۔ اُس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تحقیق و مطالعہ کے نتائج کو کھل کر بیان کرے۔ ترجمہ کی لکھائی اور چھپائی غیر معمولی طور پر دیدہ زیب اغلاظ و اسقام سے پاک ہے۔ یہ ترجمہ شروع سے اخیر تک مولانا کی قرآن پاک کے تینیں والہانہ عقیدت اور فریقتوں کا غماز ہے۔ اس عمدہ شاہکار کے لئے مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی مولانا محمد علی کے ہمیشہ رہیں احسان رہیں گے۔“

(Translation of the Holy Qur'an, page xxxvii)

یہ تھی اختلاف رائے کی اصل حقیقت جس کونہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچادیا جاتا ہے۔ مشہور عالم فاضل انگریز نو مسلم و مترجم قرآن مولانا محمد مارماڈیوک پکنھال مرحوم نے سن ۱۹۳۶ء میں حضرت مولانا محمد علی کی شاہکار انگریزی تالیف "The Religion of Islam" پر ایک طویل تبصرہ شائع کیا تھا۔ "ریجن آف اسلام" میں اس اسلام کا وہی کامل نقشہ و بیان ہے جس کی تبلیغ و ترویج مولانا محمد علی لاہوری ساری عمر کرتے رہے۔ اپنے عالمانہ تبصرے میں مولانا محمد مارماڈیوک پکنھال مرحوم لکھتے ہیں :

"اسلام کی یہ توضیح و تشریح ایک ایسے بزرگ کے زور قلم کا نتیجہ ہے جو علوم قرآن و سنت کا تبحر اور جدید عالم ہے۔ جس کے قلب میں گذشتہ پانچ صدیوں کے اسلامی تنزل کی شرمندگی اور ندامت کا احساس ہے۔ اور جس کی روح اسلام کی اُس ترقی اور تجدید کی امیدوں سے بہریز ہے جس کے آثار آج ہر طرف ہو یہاں۔"

عبدات اور فرائض دینی کے متعلق احادیث و روایات مذہبی سے بال برابر اخراج کئے بغیر فاضل مصنف نے ایک وسیع میدان پیش کیا ہے جس میں تبدیلیاں جائز ہیں، اور ہونی بھی چاہئیں۔ کیونکہ ان معاملوں میں رسوم و اعمال کی بنیاد نہ کسی قرآنی حکم پر مبنی ہے اور نہ ہی اقوال نبی کریم ﷺ پر۔ اور جو نبی ایسے امور قومی ضروریات کے پورا کرنے سے عاجز آ جائیں، ان میں تبدیلی لازمی امر ہے۔ موجودہ دور میں ایسی کتاب کا منظر شہود پر آنا واقعی ایک نعمت مترقبہ ہے۔ جب کہ بہت سے اسلامی ممالک میں ہم ایسے اشخاص پاتے ہیں، جو تجدید اور اصلاح کے جوش میں، اس علم سے محض بے بہره ہونے کی

وجہ سے نہایت فاش غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔۔۔ ہمیں کہیں کہیں مولا ناموصوف کے اُن اجتہادی نتائج و آراء سے اتفاق نہیں بھی ہوتا، جو انہوں نے بعض فروعی امور کے متعلق ظاہر فرمائے ہیں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ مولا ناموصوف کے پیش کردہ دلائل واستدلال ہمیشہ ثقہ، پر زور اور ناقابل تردید ہوتے ہیں۔ مولا ناموصوف کا والہانہ خلوص و اخلاص کسی بھی سطح پر قاری کی آنکھوں کے سامنے سے اوحصل نہیں ہوتا۔ مولا ناموصوف کا قرآن سے عشق و انہاک ہی اس عظیم الشان تصنیف کے تمام اہم امور میں صحیح و درست ہونے کی کافی ضمانت ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے لوگ بھی ہوئے جو مولا ناموصوف کے اخذ کر دھل و تعبیر کی نسبت مخالفت کا اظہار کریں گے۔ لیکن یہ وہی لوگ ہوئے جن سے اسلام کو مستقبل میں کسی فتنہ کی امید نہیں ہے۔“

(”اسلام کلچر“، حیدر آباد کن۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء)

ہمارے قارین یہ پڑھ کر ضرور حیران ہوئے کہ جہاں تک قرآن کریم کے اُن متداول تراجم اور تفاسیر کا تعلق ہے جن کو ہمارا عوامی حلقہ معتبر اور مستند جانتا ہے، اُنہی کے بارے میں خود مولا عبدالماجد ریبابادیؒ کی محققانہ رائے کچھ اس طرح ہے:

”حضرت شاہ عبدالقدار اور شیخ الہند وغیرہ کے ترجمہ قرآن اور حواشی بجاۓ خود کسے ہی صحیح و قبل قدر ہوں۔ مشنکلین اور مذہبین کے لئے مفید نہیں۔“

(مکتبات سلیمانی۔ جلد 2، حاشیہ 80 ص 32)

اس غیر متوقع رائے کی تائید کرتے ہوئے مولا نامسید سلیمان ندویؒ نے بھی یہ جملہ لکھا تھا:

”آپ نے صحیح لکھا ہے کہ ان بزرگوں کے ترجمے مشنکلین اور مذہبین کیلئے

مفید نہیں۔ اس لئے حواشی بھی اُن کے لئے مفید نہیں۔“ (ایضاً)

اب ہم اپنے اصل موضوع یعنی مفسر علام حضرت مولا نامحمد علی صاحب کی مایہ ناز شخصیت اور ان کی بے مثال قرآنی خدمات کی طرف آتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد علیا ہوریؒ

(شخصیت اور کارنامے)

لا ہور کے مشہور و معروف اردو اخبار ”انقلاب“ کے نامور مدیر مولانا عبدالجید صاحب سالک کا شمار بر صیرہ ہندوپاک کے اکابر علماء میں ہوتا ہے۔ یہ صاحب حضرت مولانا محمد علیؒ کے پڑوں میں رہتے تھے۔ لہذا دوسرے غیر احمدی علماء کی نسبت حضرت مولانا محمد علیؒ کے ذات و صفات سے زیادہ واقف تھے۔ جب 1951ء میں مولانا محمد علیؒ کی وفات ہوئی تو سالک صاحب نے اپنے اخبار میں ایک طویل ماتحتی شذرہ لکھا، جس کو جماعت احمدیہ لا ہور کے آر گن ”پیغام صلح“ نے اپنے ”مولانا محمد علیؒ نمبر“ میں شامل کیا۔ مولانا سالک نے حضرت مولانا محمد علیؒ کی مایہ افتخار شخصیت اور ہمہ پہلو خدماتِ دینیہ کو کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ مشہور محاورہ ”سمندر کو کوزہ میں بند کر دینا“، خود بخود ذہن میں مستحضر ہو جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ مولانا سالک صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

”جب میں لا ہور میں ”زمیندار“ کا ایڈیٹر مقرر ہوا اس زمانے تک مولوی ظفر علی خان اور ڈاکٹر اقبال کے مولوی محمد علی صاحب، خواجہ کمال الدین، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ، ڈاکٹر سید محمد حسین اور شیخ رحمت اللہ⁽¹⁾ سے دوستانہ تعلقات تھے۔ لیکن ان بزرگوں سے میری ملاقاتات گاہے مانے ہو اکرتی تھی۔ ”انقلاب“ جاری ہونے کے بعد مولانا محمد علی صاحب سے اکثر ملاقاتیں ہوتیں۔ مولانا احمدیہ بلڈنگس میں مسجد سے متصل مکان میں رہتے تھے۔ اور میں کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ مولانا مجھ پر بے حد شفقت فرماتے۔ مولانا محمد علی حضرت مرزا صاحب کی صحبت سے نہایت سبے اور بے کسل مسلمان بن گئے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کے قلب و دماغ میں مذہب مقدس اسلام کی عظمت کچھ اس طرح جاگزیں ہوئی کہ آپ نے اپنی بوری زندگی اس کی تبلیغ کے

(1)۔ پہلے دو چھوٹے باتی سب حضرات احمدیہ انہم اشاعت اسلام لا ہور کے بانی نمبر ہیں۔ (خورشید)

لئے وقف کر دی۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ خدمت دین میں بسرا ہوا۔ قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کے علاوہ انہوں نے دینی مسائل پر بے شمار کتابیں لکھیں۔ جن میں سے میرے نزدیک بہترین کتاب ”ریجن آف اسلام“ ہے جس کو پڑھنے کے بعد انگریزی وال شخص دین کے متعلق اس قدر مفصل معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ جو فارغ التحصیل مولویوں کو بھی نصیب نہیں ہوتیں۔

کوئی پندرہ سال سے مولوی محمد علی صاحب مسلم ٹاؤن میں رہتے تھے۔ جہاں میر اغريب خانہ بھی ہے۔ اس لئے مجلسوں اور تقریبوں میں ان سے اکثر ملاقات ہوتی تھی اور ان کی بزرگی اور تقدس کے باوجود میں ان کی خدمت میں خاصاً بے تکلف تھا۔ بلاشبہ وہ احمدی تھے لیکن دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات نہایت مخلصانہ و برادرانہ تھے۔ ایک اس لئے کہ وہ احمدیوں کی اُس شاخ کے امیر تھے۔ جس کے عقائد میں تشدیزیں، دوسرے اس لئے کہ ان کی طبیعت اصلاحیہ پسند تھی۔ وہ مسلمانوں کی تمام تحریکات میں ہمدردانہ حصہ لیتے تھے۔ کسی کی تکفیر کے روادار نہ تھے کیونکہ ان کے نزدیک تکفیر اور تبلیغ میں تضاد تھا۔

وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیاۓ مغرب کو بھی اسلام کا پیغام دیتے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر اعتبار سے اس پیغام کے پہنچانے کی اہلیت رکھتے تھے وہ صرف عالم دین نہ تھے بلکہ ایک عالی پایہ مفسر اور مجہد بھی تھے۔ اعلیٰ درجے کے انگریزی وال تھے۔ اور مغربیوں کے ذہن کو خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے اسلام کو مغربی تعلیم یا نہ طبقوں اور خود مغربیوں تک ایسے رنگ میں پہنچایا کہ وہ بے اختیار اس مذہب کی عظمت کے قائل ہو گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ممالک مغرب کے صدر ہا طالبان حق مولانا محمد علی کے مقالات اور کتابوں کو بڑھ کر مسلمان ہوئے۔ اور یہ مولانا محمد علی ہی کی مساعی کی برکت سے کہ آج ممالک مغرب میں اسلام کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ اور شاذ و نادر ہی کسی شخص کو اسلام کی مخالفت کی جرأت ہوتی ہے۔ اسلام کی بے لوث خدمت اور مدت العمر انہا کا یقیناً مولانا محمد علی کی معرفت کا باعث ہوگا۔ کیونکہ

اللہ تعالیٰ اپنے دین کے مخصوص خادموں کی سعی و جہد کو بھی ضائع نہیں کرتا۔
اس میں شک نہیں کہ عقائد میں اُن کے اور عام مسلمانوں کے درمیان تھوڑا سا فرق تھا
لیکن وہ فرق اتنا سمجھیں ہرگز نہ تھا کہ مسلمان ان کی خدماتِ دینی کو فراموش کر دیں اور ان
کی قدر نہ کریں۔“ (پیغام صلح۔ 26 دسمبر 1951ء)

مشہور صحافی، عالم دین اور مفسر قرآن، مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم لکھتے ہیں:
”مولانا محمد علی صاحب نے قرآن کا انگریزی ترجمہ کر کے اسلام کی جو مہتمم بالشان
خدمت سرانجام دی ہے۔ اس کا اعتراض نہ کرنا سورج کی روشنی سے انکار کرنا ہے۔ اس
ترجمہ کی بدولت نہ صرف ہزاروں غیر مسلموں نے اسلام کے دامن میں پناہ لی، بلکہ
ہزاروں مسلمان بھی اسلام کے زیادہ قریب آگئے۔ جہاں تک میر اتعلق ہے۔ میں نہایت
مسرت سے اعتراف کرتا ہوں کہ یہ ترجمہ ان چند کتابوں میں سے ہے جو چودہ پندرہ
سال پہلے، جب میں ظلمتوں اور دہریت کی گہرا یوں میں بھٹک رہا تھا، میرے لئے شع
ہدایت بن کر آئیں۔ اور مجھے اسلام کا سیدھا راستہ سمجھایا۔ کامریڈ والے محمد علی (جوہر)
مرحوم بھی اس ترجمہ کے بہت شائق تھے اور ہمیشہ اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔“
(خبر ”سچ“، لکھنؤ۔ 25 جون 1934ء)

قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ و تفسیر اور اردو تفسیر

”بیان القرآن“ شائع کرنے سے پہلے

جب سن ۱۹۱۳ء میں مسئلہ تکفیر کو لیکر جماعت احمدیہ میں شدید اختلاف رونما ہوا۔ اور
بسیار کوشاں کے بعد بھی سلجھائے نہ سمجھا تو حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ کو مجبوراً سب کچھ
چھوڑ چھاڑ کر قادیان سے خالی ہاتھ لا ہو آنا پڑا۔ اس ضمن میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کامندر جہ
ذیل یادگار تاریخی بیان نہایت کارآمد ہے۔ کیوں کہ اسی تاریخی شہادت کو نظر انداز کر کے ہمارے
منافیں اصل واقعات کو بلا کڑ کر کچھ سے کچھ بنادیتے ہیں :

”ایک عرصہ سے اس جماعت میں مسئلہ تکفیر کی بنا پر دو جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایک گروہ
کا یہ اعتقاد تھا کہ غیر احمدی مسلمان ہیں گو وہ مرزا صاحب کے دعووں پر ایمان نہ لائیں۔

لیکن دوسرا گروہ صاف صاف کہتا تھا کہ جو لوگ مرزا صاحب کے دعوؤں پر ایمان نہ لائیں وہ قطعی کافر ہیں۔ ان اللہ وانا الیہ راجعون۔ آخری جماعت کے رئیس صاحبزادہ بشیر الدین محمود ہیں۔ اس گروہ نے انہیں اب خلیفہ قرار دیا ہے۔ مگر پہلا گروہ تسلیم نہیں کرتا۔ مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے۔ نے اس بارے میں جو تحریر شائع کی ہے اور جس عجیب و غریب جرأت اور دلاؤری کے ساتھ قادیان میں رہ کر اظہار رائے کیا ہے۔ جہاں پہلے گروہ کے رو ساپن وہ فی الحقيقة ایک ایسا واقعہ ہے جو بمیشہ اس سال کا یادگار واقعہ سمجھا جائے گا۔” (اخبار الہل آل۔ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۱۳ء)

لاہور آ کر مولانا محمد علی صاحب نے احمد یہ بلڈنگس میں ایک نیا مرکز احمد یہ نجمن اشاعت اسلام کے نام سے قائم کیا۔ یہ مبارک مقام ہے جہاں بانی سلسلہ عالیہ احمد یہ حضرت مرا غلام احمد صاحب نے اپنے آخری ایام میں متعدد لیکچر دیئے، یہیں وفات پا کر مالک حقیقی سے جا ملے اور یہیں علامہ حکیم نور الدین مرحوم نے نمازیں بھی پڑھائیں۔ لاہور کے اس متبرک مقام کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ یہیں درس قرآن کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ درس قرآن کا یہ مبارک سلسلہ خود مولانا محمد علی صاحب نے شروع کیا۔ مولانا موصوف کے عالمانہ درس کو سننے کے لئے مختلف مکاتب اور حلقوں خیال کے پڑھ لکھے مسلمان بڑی تعداد میں حاضر ہوتے تھے۔ ان سامعین میں مولانا طفر علی خان صاحب اور علامہ اقبال مرحوم جیسے مشاہیر بھی شامل تھے۔ یعنی شاہدوں کا بیان ہے کہ مولانا محمد علی کا درس سن کر علامہ اقبال پر اکثر قوت طاری ہو جاتی اور وہ ڈھاریں مار کر روتے تھے۔ (۱) قرآن پاک کی انگریزی تفسیر اور اردو تفسیر شائع

(۱) اس زمانہ کے ایک یعنی شاہد جناب چہرہ ظہور احمد صاحب مرحوم، جو نجمن حمایت اسلام لاہور سے بھی وابستہ رہ چکے ہیں، لکھتے ہیں:-

”میں نے نجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک سکول میں اور پھر اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ اس عرصہ میں نجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں بڑی پابندی سے شرکت کرتا۔ جلسے کے پروگرام میں حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم و محفوظ کا لیکچر ہوا کرتا تھا۔ ان کا اسلوب یقیناً کہ وہ قرآن مجید کی چند آیات تلاوت فرماتے اس کی تشریح اور اس کے بعد حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور کمی اور مد نی ذور کے حالات کی روشنی میں مسلمانوں کے لئے رہنمائی کا طریق بنائے۔ اس وقت بڑے بڑے سجادہ نشین اور عالم و فاضل دم بخود ہو جاتے۔ اور ڈاکٹر سر محمد (بیقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کرنے سے پہلے حضرت مولانا محمد علی نے اپنے درسی نوٹوں کو ”نکات قرآن“ کے نام سے مختلف جلدیوں میں شائع فرمایا۔ ”نکات قرآن“ کی پہلی جلد 1915ء میں شائع ہوئی۔ چھ مختصر جلدیوں کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ پہلی جلد شائع ہوئی، تو بھی روشن دماغ اور غیر متعصب علماء نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کی غیر معمولی شان و فادیت کے پیش نظر بعض علماء نے اپنی گروہ سے اس کی کاپیاں خرید کر مسجد کے اُن اماموں میں منت تقسیم کیں جو خود خریدنے کی استعداد نہ رکھتے تھے۔ لاہور کا ایک نامور قدیم اخبار ”زمیندار“ بھی تھا۔ اس کو مولانا ظفر علی خان صاحب کے والد ماجد مولوی سراج الدین خان مرحوم نے ۱۹۰۳ء میں جاری کیا۔ اس زمانہ میں مولانا عبداللہ العمامدی اس اخبار کے ایڈیٹر اور مولانا ظفر علی خان مالک و چیف ایڈیٹر تھے۔ مولانا العمامدی نہایت اعلیٰ پایہ کے عالم و فاضل تھے۔ پہلے ”البيان“ اور کچھ عرصہ دار العلوم ندوہ کے عربی رسالہ ”الندوۃ“ کی ادارت پر بھی مامور تھے۔ ”نکات قرآن“ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقطراز ہیں:-

”جناب مولوی محمد علی صاحب ایم، اے ان عزیز الوجود بزرگوں میں سے ہیں۔ جن کی عالماں زندگی کا کوئی لمحہ خدمتِ اسلام سے خالی نہیں رہتا۔ روزانہ قرآن کریم کا درس دیتے ہیں۔ اور ہر آیت کی تفسیر میں حقائق و معارف کے دریا ہادیتے ہیں۔ حال ہی میں اس درس مقدس کے بعض اہم اقتباسات انہوں نے خود ہی قلمبند کر کے شائع فرمائے ہیں۔ جنمیں اکثر آیات جزو اول اور کسی قدر جزو ثانی کی تفسیر ہے۔ اور اس خوبی کی تفسیر کی ہے کہ

شاید اردو زبان کا خزانہ ایسے تابنا ک جواہر بریزے بڑی مشکلوں سے بھی نہ نکال
سکے۔۔۔۔۔ فاضل مفسر نے جن اصول پر تفسیر لکھی ہے۔ ان کے متعلق وہ خود تحریر فرماتے ہیں کہ زیادہ تر قرآن کریم کو قرآن کریم ہی کے دوسرے مقامات سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ یا صحابہ سے جو منعے مروی ہیں ان کو مقدم مانا ہے۔ اور اپنی رائے کو لغت کے ماتحت رکھا ہے۔ یہ نہایت پاکیزہ اصول ہیں اور یہ مفید

(بیچاہیہ) اقبال کو تو میں نے کئی مرتبہ آبدیدہ ہو کر ڈھاریں مارتے ہوئے دیکھا۔ تقریر کے الفاظ اور طرز ادا میں سادگی کے باوجود سامنے میں اس قدر جذب کی کیفیت اور تاثیر پیدا کر دیتی کہ کسی بڑے شاعر اور ادیب کو بھی یہ مرتبہ نصیب نہ ہو اور یہ توجہ کسی اور ادیب و شاعر یا لیکچر میں نظر نہیں آتی تھی۔“ (پیغام صلح۔ جلد 78۔ شمارہ 1) (خورشید)

ترین تفسیر واقع میں انہیں اصول پر ہے۔” (اخبار زمیندار 15 اپریل 1915ء)

چونکہ چیف ایڈٹر مولانا ظفر علی خان تھے، لہذا ”اخبار زمیندار“ کا یہ تبصرہ انکی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا ہی تبصرہ میرٹھ کے ماہنامہ ”اسوہ حسنہ“ میں چھپا تھا۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:-

”مولوی محمد علی ایم اے، ایم الی بی سابق ایڈٹر یو اف ریپورٹر قادیانی کی مفید تفسیر کا دوسرا حصہ ”نکات القرآن“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔۔۔ مولوی صاحب مددوح کی عمر کا بڑا حصہ قرآن حکیم میں غور و مدرسہ کرنے اور مخالفین اسلام کے اعتراضات کی تردید میں صرف ہوا ہے۔ اسلئے اگر ان کے قلم سے نکلی ہوئی تفسیر کی تعریف میں یہ کہا جائے کہ وہ موجودہ زمانہ کی بہترین مذہبی تصنیفات میں شمار ہونے کے قابل ہے تو جائے تجنب نہیں۔ ہم نے اس تفسیر کے اکثر مقامات کو غور سے برٹھا ہے اور برٹھکر بہت محظوظ ہوئے۔ واقعی امر یہ ہے کہ مولوی صاحب نے ضرورت و قتبہ کو مد نظر رکھ کر قرآن حکیم کے حقائق عالیہ پر نہایت خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ اور دریا کو کوڑہ میں بند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ غیر ضروری تطویل اور مخل مقصود اختصار، یہ دو عیب عموماً ہماری تفسیروں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن نکات القرآن ایک حد تک ان سے پاک ہے۔ اس تفسیر میں مناسب موقع اُن شکوک و شبہات کے بھی شافی جواب دیئے گئے ہیں جو جدید تعلیم یا صحبت کے اثر سے ناواقف مسلمانوں کی طبیعتوں میں پیدا ہوتے یا اقوام غیر کی جانب سے کئے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ تفسیر ان لوگوں کے لئے بھی کارآمد ہے جو تبلیغ اسلام میں کچھ دلچسپی لیتے ہیں۔ علی ہذا جو لوگ اس مغالطہ میں بڑے ہوئے ہیں کہ قرآن مجید کی تعلیمات محض روحانی دائرہ تک محدود ہیں اور معاشرتی اور تمدنی یا سیاسی امور سے انہیں کوئی تعلق نہیں۔ اس تفسیر کے مطالعہ سے ان کی غلط فہمیاں بھی بہت کچھ رفع ہو سکتی ہیں۔ نکات القرآن کی زبان سلیمانی اور آسان ہے۔ اور اس میں مولویانہ الحسن نہیں ہے۔ جس سے تھوڑی قابلیت رکھنے والے کو مطلب سمجھنے میں وقت ہو۔“ (ماہنامہ ”اسوہ حسنہ“ میرٹھ، جولائی 1916ء)

حضرت مولانا محمد علیؒ کے انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن اور اردو تفسیر ‘بیان القرآن’ کا شاندار استقبال

حضرت مولانا محمد علی صاحب کی انگریزی تفسیر بڑی آب و تاب کے ساتھ 1917ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ مشرق اور مغرب کے تمام علمی اور ادبی حلقوں نے اس کا پڑ جوش استقبال کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مخالفین اسلام کے بہت سارے شکوک اور اعتراضات کا خاتمہ ہونے لگا۔ مغرب کے نامور تاریخ نویس اور فقاد ایج، جی، ولیس (H.G.Wells) نے 1920ء میں اپنی مشہور زمانہ تصنیف "The Outline of History" میں مولانا محمد علی صاحب کے انگریزی ترجمہ القرآن کی تیسری سورت کا 16واں روپ نقل کرتے ہوئے یہ الفاظ تحریر کیے:-

"یہ قرآن شریف کی چند شاندار آیتیں ہیں جن کو ہم نے اُس" "Orthodox" (راخِ عقیدہ و معتقد) ترجمہ سے نقل کیا ہے جس کو حال ہی میں مولوی محمد علی صاحب نے شائع کیا ہے"

(The outline of History, H.G. Wells, 1920, P.267)

تاریخ عالم کا ایک ناقابل فراموش اور بیادگارِ واقعہ

خبر پیغام صلح لاہور کے 5 اگست 1970 کے شمارے میں احمدی درس قرآن کی طویل تاریخ چھپی ہے۔ جس میں جماعت کے جزل سیکریٹری جناب مرزا معصوم بیگ۔ ایم۔ اے۔ نے تاریخ عالم کے حوالے سے ایک غیر معمولی انکشاف درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"مغربی لوگ اگرچہ عقیدتاً مسلمان نہیں ہیں۔ لیکن عملًا وہ قرآن کریم کے آگے سر جھکاچکے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے موقعہ پر۔۔۔ ایک ایسا وقت آیا کہ امریکہ کو خدا شہ

پیدا ہو گیا کہ اس کا وجود صفحہ ہستی سے نابود ہو جائے گا۔ اس وقت یہ تجویز ہوئی کہ زمین کے نیچے ایک شہر آباد کیا جائے۔ جس میں دُنیا کی تمام نادر اشیاء بحفاظت رکھی جائیں۔ تاکہ بعد میں آنے والی نسلیں جب چاہیں زمین کھو دکران اشیاء کو حاصل کر سکیں۔ اور جن اشیاء کو وہاں رکھنے کی تجویز ہوئی، ان میں باہم اور قرآن بھی تھا۔ اور ہماری انجمن کوچھی آئی کہ حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ کا ترجمۃ القرآن اس غرض کے لئے بھیجا جائے اور وہ ترجمہ ہماری طرف سے ارسال کر دیا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا مرحوم کے ترجمہ کو کیا خصوصیت حاصل ہے۔“

ہم یہاں وہ تمام بے شمار آراء، تحریکے اور تصریحے نقل تو نہیں کر سکتے جو اس ترجمہ و تفسیر کے بارے میں دُنیا کے مختلف اخبارات، رسائلہ جات اور کتب وغیرہ میں چھپتے رہے۔ کیوں کہ وہ اتنے زیادہ ہیں کہ اگر کٹھا کر دیئے جائیں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ بس نمودۂ کچھ اقتباسات ہدایہ خدمت ہیں، ملاحظہ فرمائیں :

متعدد ہندوستان کے مشہور عالم فاضل مسلم لیڈر مولانا محمد علی جو ہر اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اپنی نظر بندی کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قریباً یہی وہ وقت تھا جب کہ ایک مشق دوست نے ایک ایسا تھہ ہمیں بھیجا (۱) جس سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ یہ قرآن کریم کا نجح تھا جو نہایت اعلیٰ درجہ پر چھپوا یا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ اگریزی زبان میں نہایت صحیح ترجمہ اور معلومات سے بھرے ہوئے نوٹ درج ہیں۔ جو کہ قرآن کریم کی تفاسیر اور حسف یہود و نصاریٰ کے گھرے مطالعہ برپتی ہیں۔ یہ میرے فاضل ہنمام مولانا محمد علی صاحب لاہوری کا کارنامہ ہے۔ جو ایک بہت بڑی مذہبی جماعت کے سربراہ اور لیڈر ہیں۔ اور اس جماعت کے کچھ ممبر انگلستان میں تبلیغ اسلام کا کام کر رہے ہیں۔ اور انہوں نے مسجد و دوکنگ میں مشن قائم کر رکھا ہے۔ یہ ترجمہ اور اس کے حوالی اس زہر کا نہایت ضروری تریاق ہیں جو سیل۔ راؤ ویل۔ اور بام رجیسٹر اگریزی مترجمین کے فٹ نوٹوں میں پایا جاتا ہے۔ اور اس

(۱)۔ یہ تھہ جماعت احمدیہ لاہور کے نامور ممبر ڈاکٹر مرزی العقوب بیگ نے بھیجا تھا۔ (خورشید)

ذہنی کیفیت میں جس میں اس وقت بتلا تھا، میں نے اس دوست کو جس نے قرآن کریم کے یہ نئے بھیجے تھے یہ لکھا کہ میرے لئے اس سے بڑھ کر کوئی چیز خوش گن نہیں ہو سکتی کہ جو نہیں میں ان قیود سے، جو نظر بندی کی حالت میں مجھ پر عائد ہیں، آزاد ہو جاؤں۔ یورپ چلا جاؤں اور ان لوگوں کے، جنکے دماغ جنگ کے اثر سے پاگل ہو چکے ہیں۔ ہر ایک پارک سے اور ہر بازار سے اس پاک مذہب کی تلقین کروں۔ جوان جنگ کرنے والی قوموں کے شور و غل کو اسلام کے متعدد کرنے والے امن و امان میں خاموش کرو سکتا ہے۔” (بحوالہ۔ مجاہد کبیر۔ ص ۱۲۸)

مولانا محمد علی جو ہر معمولی انسان نہ تھے۔ وہ انگریزی کے ساتھ ساتھ عربی کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی¹ نے اپنے انگریزی ترجمۃ القرآن کی bibliography (کتابیات) میں مولانا جو ہر کو بطور اخترائی پیش کیا ہے۔ مولانا جو ہر جیسے نابغہ روزگار اور مستند عالم دین نے جورائے حضرت مولانا محمد علی لاہوری کے ترجمۃ القرآن کے متعلق ظاہر کی ہے۔ اس سے بہتر الفاظ میں اس شاندار تفسیر کو سراہا نہیں جاسکتا۔ پرتعصب کا برا ہو، متعصب آنکھ کو دوسروں کی اچھائی نظر ہی نہیں آتی۔ وہ کسی نہ کسی بہانے کہ تمان حق کا ارتکاب کر ہی لیتی ہے۔ دارالعلوم ندوۃ کے سربراہ مولانا ابو الحسن علی ندوی کا تعصب میں ڈوبا ہوا یہ بیان ملاحظہ فرمائیں :

”لاہور کی جماعت احمدیہ نے تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے انگریزی زبان میں اسلامی لٹریچر تیار کرنے کے کام سے خاصی دلچسپی لی۔ ان کے کام کو ہندو ہیر و نہنڈ کے تعلیم یافتہ طبقہ میں انگریزی زبان میں ہونے اور اچھے انداز میں پیش کئے جانے کی وجہ سے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان مصنفوں میں سرفہrst خود جماعت احمدیہ لاہور کے باñی و امیر مولوی محمد علی لاہوری ہیں۔ جنہوں نے انگریزی زبان میں قرآن کا ترجمہ شائع کیا۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات نے اس کو ہاتھوں ہاتھ کیا۔ ان کے قلم سے جو تشریحات و حوالش نکلے ان سے ایسے بہت سے افراد متاثر ہوئے جن کا اسلام اور علوم اسلام کا مطالعہ برآ راست اور گہرائی تھا۔ اور جدید نظریات و تحقیقات اور سائنس کی ترقی سے مرعوب تھے۔ اور جن کو ایسی کتابوں اور اسلام کی ایسی تشریحات کی تلاش تھی جو ان کی علمی و مذہبی پیاس

بجھا سکے۔ ان کے تفسیری نوٹس میں مجوزات اور غیری حقائق کو طبعی اشیاء اور عام قانون
قدرت کے تابع بنانے کا رنگ مبالغہ آمیزی و انتہا پسندی کی حد تک غالب ہے۔۔۔“
(اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفوں میں صفحہ ۳۲ و ۳۳)

مولانا محمد علی جوہر جیسے جید عالم دین کی ماہر امام اور عالمانہ رائے کے سامنے مولانا علی میاں ندوی
کے تعصب سے بھرے اس بیان کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟ کیا مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے بارے
میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ :

”ان کا اسلام اور علوم اسلام کا مطالعہ براہ راست اور گمراہ تھا۔ اور وہ جدید نظریات
و تحقیقات اور سائنس کی ترقی سے مروع تھے۔ اور ان کو ایسی کتابوں اور اسلام کی ایسی
تشریحات کی تلاش تھی جو ان کی علمی و مذہبی پیاس بجھا سکے۔“

مولانا علی میاں ندوی کے چیتے مفسر قرآن مولانا عبدالمadjed ریاضی نے جب پہلی بار انی
اردو تفسیر شائع کی تو اس میں مولانا محمد علی لاہوری کے آگے فقط اتنا لکھ دیا تھا ”ترجمہ کی حد تک
قابل قدر ہے۔“ شاید اس لئے کہ عوامی حلق میں ہیئے نہ پڑیں۔ لیکن جب اسی تفسیر کو نظر ثانی کے
بعد تاج کمپنی کے حوالے کیا گیا تو وہاں یہ جملہ با تخصیص لکھ دیا گیا :
”مغربیت سے متاثر گروہ کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہو گا۔“

مولانا محمد علی جوہر کی ولی تمنا

جب مولانا محمد علی جوہر صاحب را وڈیبل کانفرنس میں شرکت کرنے لندن جا رہے
تھے، تو جانے سے پہلے مولانا محمد علی لاہوری سے ملاقات کے لئے خاص طور پر لاہور
پہنچے۔ اور دوران گفتگو مولانا محمد علی لاہوری سے کہا : مولانا اگر وہاں کے لوگ مجھ سے یہ سوال
کریں کہ کیا قرآن کا انگریزی ترجمہ کرنے والے آپ ہی ہیں؟ تو کیا میں ہاں کر لیا کروں؟ اس پر
حضرت مولانا محمد علی نے ہستے ہوئے فرمایا : اس میں کیا شک کہ یہ ترجمہ محمد علی نے ہی کیا ہے۔
(ماخوذ از اخبار پیغام صلح لاہور۔ مورخہ ۱۹۶۹ء کتوبر ۱۹۶۹ء)

اخبار ”کویسٹ“ لندن :

”بے شک یہ ایک ایسی تصنیف ہے جس پر ایک عالم فاضل انسان فخر کر سکتا ہے۔“

مشہور مصنف اور دانشور المس-اتج-لیڈر (انگلستان) :

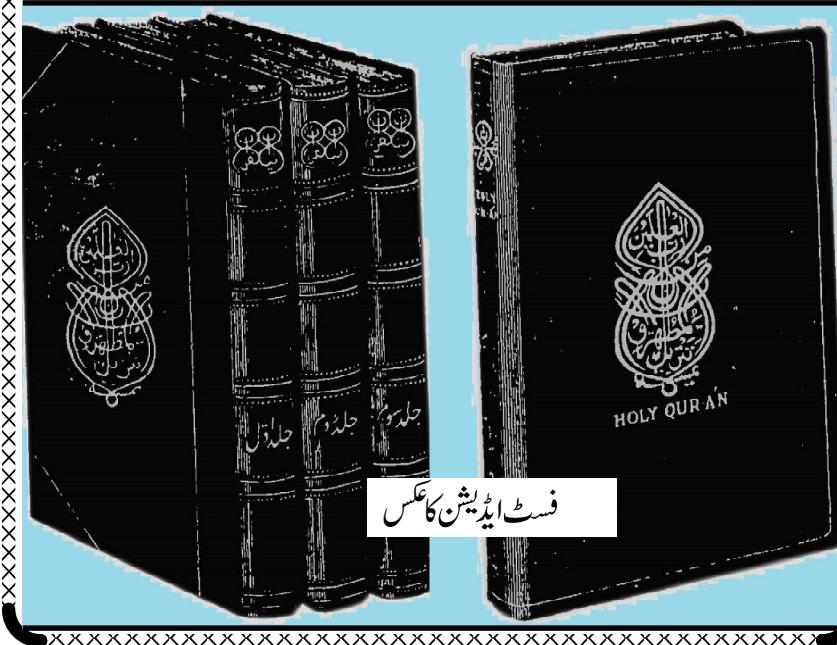
”آپ کی مذہبی کتاب کے اتنے اعلیٰ درجہ پر اور خوبصورتی کے ساتھ چھپنے پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اس کے اندر جنور اور علم و فضل بھرا ہوا ہے اس کو دیکھا جائے تو ہمارا دل آپ کی اتنی بڑی عزت کے لئے تشکر کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ یہ ترجمہ دُنیا کی مذہبی تاریخ میں ایک نئے دور کی ابتداء ہے۔“

اخبار ”مدرس میل“ بھارت :

”مولانا محمد علی کا نام ہی اس ترجمہ کی عمدگی اور رشگی کا ضامن ہے۔ شاید یہ کوئی انگریزی ترجمہ اتنے اعلیٰ پایہ کا ہو۔“

اخبار ”ہندو“ مدرس :

”اس کے مصنف صحیح اور قابل اعتماد ترجمہ کے لئے مشہور ہیں۔ کتاب کے مقدمہ میں اور تشریحی نوٹوں میں علم کا ایک خزانہ موجود ہے۔“



ہندوستان کی تحریک آزادی میں

مولانا محمد علی کے انگریزی ترجمہ قران کارول

تحریک آزادی کے سلسلہ میں بھارت کے پہلے پرائیمنٹر پنڈت جواہر لعل نہر و کومتعدد بار جیل جانا پڑا۔ اُن کے وہ سارے مکتب شائع ہو چکے ہیں، جوانہوں نے مختلف جیلوں میں وقار فوجاً افسران جیل کو بھیجے تھے۔ ایک خط میں انہوں نے مطالعہ کے لئے کتابوں کی لمبی لسٹ بھجوائی ہے۔ اس لسٹ میں سرفہرست مولانا محمد علی صاحب کی انگریزی تفسیر قرآن ہی ہے۔

ایک بار گاندھی جی نے ”بہاد“ کے بارے میں کوئی ناروا بات لکھ دی۔ جس پر حضرت مولانا محمد علی نے اپنے دہلی کے مبلغ مولانا شیخ عبدالحق صاحب کے ہاتھ اپنی انگریزی تفسیر گاندھی جی کو بھجوائی۔ مولانا شیخ عبدالحق صاحب کا بیان ہے:-

”جب مجھے گاندھی جی سے دوبارہ ملاقات کا موقعہ ملا تو یقین مانیے انہوں نے مولانا محمد علی کا نام سنتے ہی بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ اور بڑی دیریک مولانا محمد علی کی تعریف کرتے رہے۔ اور مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے صحابہ کے تینیں عزت و تبریم کا جو جذبہ میرے اندر پیدا ہوا ہے۔ وہ ”ڈاکٹر“ صاحب کی کتابوں کو پڑھ کر ہی ہوا ہے۔ میں جیران ہوا کہ وہ کون سے ڈاکٹر صاحب ہیں جن کا مہاتما جی پر اتنا گہرا اثر ہے۔ جب میں نے باتوں باتوں میں ”ڈاکٹر“ صاحب کے بارے میں دریافت کیا تو گاندھی جی نے فرمایا کہ میری مراد مولانا محمد علی لا ہو ری ہیں۔“ (بیانام ص 25 25 اکتوبر 1978)

اس بات کا ثبوت گاندھی جی کی تحریرات میں بھی ملتا ہے۔ انہوں نے ہر جگہ مولانا محمد علی کے نام کے آگے ”Doctor“ بھی لکھا ہے۔ ”ڈاکٹر“ انگریزی میں ”علماء“ کو کہتے ہیں۔ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ جب ہم نے مولانا محمد علی کی انگریزی تصنیفات کو مسلمانوں کے قدیم ترین اور معترض ترین دینی ادارے ”الازہر الشریف“ مصر کے جید علماء کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ وہ ان مقامات کی نشاندہی کر دیں، جو ان کے خیال میں غیر اسلامی ہیں، تاکہ عربی میں منتقل کرنے سے پہلے ان عبارتوں کو حذف کر دیا جائے۔ پورے ایک سال کے بعد جو سرطیقیٹ ازہر کے

علماء نے جاری کیا، اس میں یہی لکھا کہ مولا نامحمد علی کی "جملہ انگریزی کتب انگریزی خوان طبقہ کے لئے نہایت کارآمد ہیں۔ اور یہ بھی کہ ہمیں ان کتابوں میں کوئی بات ایسی نظر نہ آئی جس کو اسلامی معتقدات کے معنی فراہدیا جائے۔" جامع الازہر کے سربراہ حضرت علامہ شیخ محمد طباطبائی نے ہمارے نمائندے کو یہاں تک کہہ دیا کہ اس غظیم المرتبہ عالم دین کے لئے صرف مولا نامحمد علی کہنا یا لکھنا کافی نہیں۔ ان کے نام کے آگے "علامہ" جوڑ دیا جائے۔ کیونکہ وہ اس لفظ کے زیادہ مستحق ہیں۔ اور جب ہم نے علامہ طباطبائی سے "ریلیجن آف اسلام" کے عربی ترجمہ "الدین الاسلامی" کے لئے تقریباً لکھنے کی درخواست کی۔ تو انہوں نے خوشی سے درخواست کو قبول کیا۔ اور خود اپنے قلم سے ایک شاندار تقریب لکھ کر دے دی۔ اس تقریب میں علامہ طباطبائی نے اپنے ہاتھ سے مولا نامحمد علی کے آگے "علامہ" کا لفظ ایزا دکیا۔ **فالحمد لله علی ذالک**. اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مولا نامحمد علی صاحب کی لگ بھگ سبھی انگریزی تصنیفات کے عربی ترجم "الازہر کے سرٹیفکیٹ" کے ساتھ مصر ہی سے شائع ہو چکے ہیں۔ اب انکو عرب کی جملہ لا بہریوں میں بھیجا جا رہا ہے۔

سن ۱۴۲۷ھ میں (یعنی لگ بھگ دو دہائیاں پہلے) **کشیح الازہر جناب ڈاکٹر محمد سید طباطبائی** نے جامع الازہر کے آفیش آرگن "الازہر" کے ذی القعدہ کے شمارے میں پیلسن کے پوپ کے جہاد سے متعلق اعتراضات کا مدل جواب لکھا، جس کو تین زبانوں (عربی، انگریزی اور فرانچ) میں شائع کیا گیا۔ قارئین جیران ہونگے کے دُنیاۓ اسلام کے اتنے بڑے اور جیہد عالم دین نے اپنے بیان کی تائید میں حضرت مولا نامحمد علی لا ہوری ہی کو پیش کیا ہے۔ اصل عربی عبارت یوں ہے :

"وقد صرحت بذلك منذ أكثر من سبعين سنة العلامة مولا ناصح محمد على في كتابه القيم "الدين الاسلامي" فقال في ص ۳۱۳ :

"هناك سوء فهم شديد شائع لمعنى فريضة الجهاد في الإسلام يرجع إلى افتراض أن كلمة الجهاد مرادفة لكلمة الحرب ؟ فحتى كبار الباحثين في أوروبا لم يذلوها جهاداً يذكر في الرجوع إلى اي من معاجم اللغة العربية أو القرآن الكريم من أجل معرفة المعنى الحقيقي للكلمة. وقد أصبح سوء الفهم ذاك شائعاً... الجهاد والمجاهدة يعنيان استفراغ الجهود... الجهاد ثلاثة اقسام : الاول . مجاهدة العدو

الظاهر. الثاني. مجاهدة الشيطان. الثالث. مجاهدة النفس...” (مجله ”الازهر“، ص ٣٢٥-٣٥٣) ترجمہ۔ ستر سال قبل علامہ مولانا محمد علی صاحب نے اپنی مایہ ناز تاتیف ”الدین الاسلامی“ کے صفحہ ٣١٣ پر جہاد کی اصل حقیقت یوں بیان فرمائی ہے: ”جہاد کے متعلق بہت بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ لفظ جہاد کو ”حرب“ (جنگ) کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے محققین نے بھی عربی زبان کی لغت کو دیکھنے کی رسمت گورنمنٹس کی اور نہ ہی کبھی اس لفظ کے اصل معنی معلوم کرنے کے لئے قرآن کریم کو کھوکھا دیکھا۔ نتیجہ یہ کہ یہ غلط فہمی عام ہو گئی ہے۔۔۔ الْجَهَادُ يَا الْمُجَاهِدَةُ کے معنی ہیں دشمن کے دفاع کے لئے طاقت صرف کرنا۔۔۔ جہاد یعنی جدوجہد کا عمل میں لانا تین قسم پر مشتمل ہے: ایک۔ کھلے دشمن کے خلاف، دوسرا۔ شیطان کے خلاف اور تیسرا۔ نفس کے خلاف۔۔۔“

جن دنوں مرارجی ڈیسائی صاحب ہندوستان کے پرائم منسٹر تھے، کسی تقریب میں جماعتِ اسلامی والوں نے انہیں علامہ یوسف علی کی انگریزی تفسیر قرآن تختہ پیش کی۔ مرارجی نے اُسے شکریہ کے ساتھ لے تو لیا لیکن ساتھ ہی یہ فرمایا کہ میرے پاس اس سے عمدہ تفسیر مولانا محمد علی لاہوری کی پہلے سے موجود ہے۔ یہ بات اس وقت پر لیں میں بھی آئی تھی۔ امریکہ سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامہ ”بشارات احمدیہ“ نے اپنے دسمبر 2012ء کے شمارہ میں دہلی کے مشہور اردو جریدے ”صحافت“ مورخہ ۱۶ ار جولائی 2011ء کے حوالہ سے ایک غیر معمولی تاریخی انساف نقل کیا ہے لکھا ہے:-

”گاندھی جی کے روزانہ معمول میں گیتا، قرآن اور بائل کی تلاوت شامل تھی، ہر صبح مولانا محمد علی (لاہوری) کے ترجمۃ القرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر سناتے..... حالانکہ محمد مارماڈیوک پکتھاں، عبداللہ یوسف علی اور عبدالماجد دریابادی کے انگریزی تراجم قرآن بالترتیب، 1930ء، 1934ء اور 1941ء میں منظر عام پر آچکے تھے۔ لیکن گاندھی جی صرف محمد علی احمدی ہی کا ترجمہ پڑھا کرتے۔ جس کی وجہ سے اس ترجمہ قرآن کو کافی شہرت مل گئی۔ اور بہت سارے عوامی نمائندگان نے جو گاندھی جی کے قریب تھے، اسی ترجمہ کو پڑھنا شروع کر دیا۔“

انہی زمانے میں بھارت کے دوسرے عالم فاضل صدر ڈاکٹر رادھا کرشن بھی تھے۔ قرآن اور شواہد سے یہی لگتا ہے کہ انہوں نے مولانا محمد علی کی انگریزی تفسیر قرآن کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ ”صحافت“ نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ڈاکٹر رادھا کرشن نے فروری 1962ء میں اپنے ایک ماتحت افسر کو یہ نوٹ کھیجوایا تھا:

”براہ کرم میرے لئے محمد علی احمدی کے انگریزی ترجمۃ القرآن کی ایک کاپی فراہم کی جائے، کیونکہ جو کاپی میرے زیر مطالعہ ہے وہ کافی پرانی ہو چکی ہے۔“

NewAgeIslam.Com نے اسی خبر کو اردو پر لیں کے حوالے سے پوری تفصیل کے ساتھ اردو سے انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ اس مقالے میں مذکورہ افسر کا نام غلام رسول متواتر آیا ہے۔ متعصب مقالہ نگار نے اس بات پر سخت تعب و تشویش کا اظہار کیا ہے کہ مولانا محمد مارڈ یوک پکھال، علامہ یوسف علی اور مولانا عبدالمadjid ریاضی کے انگریزی تراجم موجود ہونے کے باوجود کیوں مولانا محمد علی احمدی ہی کی تفسیر گاندھی جی اور ان کے حلقة میں پڑھی جاتی رہی۔ ان تمام محركات اور اسباب کا پتہ لگایا جانا ضروری ہے۔ مقالہ نگار کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"It is a matter of research as to who advised him (i.e.Mahatma Gandhi) to read Muhammad Ali Ahmadi's Quran because Muhammad Ali Ahmadi was the greatest flag bearer of Qadianism in the subcontinent who promoted Qadianism with his venomous English writings....."

اصل مقالہ سے پہلے نیٹ کے ایڈٹر نے "Was Mahatma Gandhi inclined towards Ahmadism?" کے عنوان سے ایک نہایت عالمانہ نوٹ درج کیا ہے۔ نوٹ اس قابل ہے کہ اس کو حد یہ قارین کیا جائے۔ ملاحظہ فرمائیں:

”اردو پر لیں کا یہ پر لیں نوٹ حسب دستور عصیت اور فرقہ وارانہ تعصب سے بھرا ہوا ہے۔ تاہم اس بیان سے اس بات کا پتہ تو چلتا ہے کہ مہاتما گاندھی اور بھارت کی دیگر نمور ہستیاں کس حد تک مولانا محمد علی کے شاندار انگریزی ترجمۃ القرآن کی شائق و مداعح تھیں۔ ہمارے جاہل علماء کے نزدیک کسی بھی احمدی مصنف کی تحریکلمہ کفر کے

مترادف ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کی کمزور اور تنگ نظر آنکھ چیزوں کی گہرائی کو دیکھنے اور سمجھنے سے قادر ہے۔ ویسے مولانا محمد علی اپنے ایک اور علمی شاہکار "The Religion of Islam" کے لئے بھی مشہور ہیں۔ اس کتاب مسطاب میں ہمارے دین اور عقائد کی کامل وضاحت ہے۔ اس میں موجود رہنمائی دورِ حاضرہ کے تمام تقاضے پورا کرتی ہے۔ اس دور سے بھی کہیں بڑھ کر جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ مولانا محمد علی جناب مرزا غلام احمد صاحب کے ہم عصر تھے۔ وہ جناب مرزا صاحب کو فقط مجدد مانتے تھے۔ (قادیانی) احمد یوں کی طرح غیر تشریعی نبی نہیں۔ لیکن ہمارے نام نہاد علماء میں اتنی بھی لیاقت نہیں کہ وہ اس فرقہ کی سمجھ سکیں۔ اگر کوئی شخص جناب مرزا صاحب کی اسلام سے متعلق کسی عمدہ ترین تحریر کی تعریف و توصیف کر دے تو یہ بات بھی ہمارے علماء کے نزدیک کفر کے برابر ہے۔"

سن ۱۹۲۵ء میں کابل کے فرسودہ خیال قدامت پسند علماء نے نجت اللہ خان نامی ایک قادیانی مبلغ کو مرتد ہھرا کر سنگسار کر دیا۔ ہندوستانی علماء نے کابلی علماء کو بڑا سر اہا اور اس حرکت کو سنت رسول اور قرآنی تعلیمات کے عین مطابق قرار دیا۔ مہاتما گاندھی نے تنگ نظر اور جاہل علماء کے اس وحشیانہ فیصلے کو اسلامی تعلیمات کا غنماز قرار دے کر "ینگ انڈیا" میں ایک زبردست نوٹ لکھا، جس پر مولانا محمد علی نے مہاتما گاندھی کو لاہور سے ایک تار بھیجا۔ گاندھی جی نے اس تار کو شکریہ کے ساتھ بمع جواب اپنے اخبار میں شائع کر دیا۔ اس خط و کتابت کو اسی زمانہ میں احمد یا بھجن اشاعت اسلام لاہور کے نقیب و آرگن اخبار "پیغام صلح" نے بھی چھاپا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں:

"مولانا محمد علی کا تار

قرآن نے کسی بھی جرم پر جرم کی سزا کا حکم نہیں دیا۔ آپ کا نوٹ اسلام اور اس کے نبی ﷺ کے حق میں غیر منصفانہ ہے۔ اور خطرہ ہے کہ اس سے دنیا میں اسلام کے خلاف سخت تعصیب پھیل جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے خود سوچ سمجھ کر اس رائے کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ سُنی سنائی بات کو لکھ دیا ہے۔ میرے انگریزی ترجمۃ القرآن کے ان مقامات کو اگر آپ ملاحظہ فرمائیں جہاں اس مسئلہ کا ذکر ہے تو آپ کو یہ یقین ہو جائیگا کہ

آپ کو جن لوگوں نے ایسی اطلاع دی ہے وہ غلطی پر ہیں۔ خدا کے لئے آپ اس پر غور کریں۔ اور اس کی تردید کریں۔“

مہاتماجی کا جواب

”ڈاکٹر محمد علی (حضرت امیر ایادہ اللہ) نے میری تقدیکو غلط سمجھا ہے۔ میں جانتا تھا کہ بعض لوگوں نے رجم کو ایک ایسی سزا قرار دیا ہے، جس کو بعض حالات میں قرآن نے بیان کیا ہے۔ اپنی طرف سے کسی رائے کا اظہار کئے بغیر کہ آیا سزا قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہے یا نہیں۔ میں نے صرف اس قدر کہا کہ اس کو محض قرآن کہ سند پر صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا۔ میں خوش ہوں کہ ڈاکٹر محمد علی نے مجھے یقین دلایا ہے، کہ قرآن میں رجم والی کوئی سزا نہیں۔ میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ وہ کوئی وجوہات ہیں جن کی بنا پر کابل میں ایسی سزا کو حق بجانب قرار دیا گیا۔ اور ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے ایک فریق نے اسکی تائید کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی طرف سے سزاے رجم کے خلاف متحده طور پر نفرت کا اظہار ہو۔ اگر ایسا ہو سکے تو اس سے آئندہ اسلامی دنیا میں ایسی سزا کا اعادہ غیر ممکن ہو جائے۔“ (بحوالہ پیغام صلح لاہور۔ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۲۵ء)

اسی ضمن میں لندن سے مبلغ اسلام الحاج خواجہ کمال الدین نے بھی ایک مکتوب گاندھی جی کو بھیجا تھا۔ گاندھی جی نے اس خط کو بھی ”یہنگ انڈیا“ میں شائع کر دیا تھا۔ یہ خط و کتابت ووکنگ کے مشہور عالم رسالہ ”اسلام کریویو“ میں موجود ہے۔

قائد اعظم حضرت محمد علی جناح

قائد اعظم محمد علی جناح اس وقت سے حضرت مولانا محمد علی کے ملنے والوں میں تھے جب کہ وہ محض مسٹر جناح تھے۔ جب وہ مسلمانوں کے قائد اعظم بنئے تب بھی وہ دن کے اجلے میں علی الاعلان سب کے سامنے مولانا کی کوٹھی واقع مسلم ٹاؤن لاہور پر تشریف لاتے رہے۔ تشدید پسند اور تنگ نظر احراری علماء نے متعدد بار یہی چاہا کہ قائد اعظم احمدی مسلمانوں کو مسلم لیگ کا ممبر بننے سے روک دیں۔ لیکن قائد اعظم نے ان کی اس ڈیمانڈ کو ہمیشہ سختی سے رد کر دیا۔ اور کہا کہ ہر وہ شخص

مسلمان کھلانے اور مسلمان سمجھا جانے کا حقدار ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو۔ خیریہ ایک الگ موضوع ہے، ہم یہاں اس پربات نہیں کریں گے۔ مشہور مبلغ اسلام مولانا مرزا مظفر بیگ صاحب ساطع جب اپنی میعاد پوری کر کے فتحی سے واپس وطن لوٹے تو ۱۹۳۹ء میں انہوں نے کراچی، بمبئی، مدراس، حیدرآباد کن، آگرہ اور دہلی کا ایک طویل تبلیغی دورہ کیا، جس میں انہوں نے بہت سارے سرکردہ مسلمان رہنماؤں سے بھی ملاقات کی۔ قائدِ اعظم سے ملاقات کی رواداد بیان کرتے ہوئے مولانا ساطع فرماتے ہیں :

”میں بمبئی مالا بارہل پر قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے گیا۔ میں نے انہیں کہا: ”آپ داڑھی منڈاتے ہیں مگر آپ پر یہ کس قدر خدا کا احسان ہے کہ بڑی اور لمبی داڑھیوں والے پیر اور مولوی آپ کے جھنڈے تے جمع ہو گئے ہیں۔ آپ خدا کا جتنا شکر ادا کریں تھوڑا ہے۔“

مُسکرا کر فرمانے لگے یہ ”بالکل درست ہے اور میں ہر روز خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔“
اس پر میں نے کہا :

”ایک محمد علی آپ ہیں جو مسلمانوں کے لئے سیاست میں لگے ہوئے ہیں۔ اور ایک محمد علی ندیبات میں لگے ہوئے ہیں اور اسلام کو ان کے شاہکار لڑپر نئی شان بخش دی ہے۔“

فرمایا : ”مولانا محمد علی کا تمام لڑپر یہ دیکھئے میری الماریوں میں موجود ہے۔ اور میں تو اردو تک نہیں جانتا۔ عربی کیا جاؤں۔ میں نے ان ہی کتابوں سے اسلام کو سیکھا اور سمجھا ہے۔“

(لیکھ مولانا ساطع۔ مندرجہ پیغام صلح۔ مورخہ ۱۹۲۹ء۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء)

لاہوریوں کے ایک اور نامور مبلغ اسلام مولانا سید انתר حسین گیلانی نے ۱۹۲۲ء میں اپنی ملاقات کا احوال اخبار ”پیغام صلح“ میں شائع کروایا تھا۔ اس وقت قائدِ اعظم حیات ہی تھے۔ اخبار ”مسٹر جناح سے ملاقات“ کی سرخی کے تحت لکھتا ہے :

”حضرت امیر ایدہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق آپ کی طرف سے ”مینوں آف حدیث“ کا ایک نسخہ بطور ہدیہ پیش کرنے کے لئے جناب سید انתר حسین صاحب

گیلانی ۱۲ نومبر کو قائد اعظم محمد علی جناح کی کوٹھی نمبر ۰۰ اور نگ زیب روڈ، نئی دہلی پہنچ۔ اتفاق سے قائد اعظم کا یہ آرام کا دن تھا۔ اور انہوں نے نیچے نہیں اترنا تھا۔ چنانچہ بٹھان دربان سید صاحب کا کارڈ قائد اعظم کے پاس لے جانے سے بہت ڈرتا تھا۔ لیکن قائد اعظم کی ہمیشہ محترمہ خود قائد اعظم کو اطلاع دینے لگئیں، اور سید صاحب کو اپر مسٹر جناح کے کمرے میں ملاقات کے لئے بلا یا گیا۔ مسٹر جناح نے خوشی سے ہدیہ قبول کیا اور کہا کہ وہ خود حضرت مولانا محمد علی صاحب کو شکریہ کا خط لکھیں گے۔ مسٹر جناح ”ڈیون پورٹ کے مضمایں اسلام پر“، جنہیں محمد امین پیر مسٹر نے لاہور سے شائع کرایا ہے پڑھ رہے تھے۔ اور اس سلسلے میں اپنے نتائج سید صاحب کے سامنے بیان کرنے لگے۔ سید صاحب نے بالتفصیل عرض کیا کہ مغرب کسر طرح اسلام کی تعلیم کا محتاج ہے۔ اور اس امر کا سقد راحساس مغرب کے اہل فکر اصحاب کو ہو چکا ہے۔ سلسلہ گفتگو ہندوستانی یونیورسٹیوں کی طرف راجع ہوا۔ اور سید صاحب نے اس امر پر خصوصیت سے زور دیا کہ جب تک مسلمان نوجوان قرآن و سنت سے پورے واقف نہ ہوں گے اور اپنی تاریخ و تمدن کا علم نہ رکھیں گے، پاکستان کی بنیادیں مضبوط نہ ہوں گی۔ قرآن حدیث اور سیرت پر اردو اور انگریزی میں اتنا لڑپچھر ہے کہ ہر یونیورسٹی آسانی سے اس کی کوپرا کر سکتی ہے۔ قائد اعظم نے اس خیال کو بہت پسند کیا۔ کہ قرآن مجید ہی درحقیقت ہماری تمام سیاست کی بنیاد ہے۔ اور اسی کو سمجھنا اور سمجھنا ہمارے مقاصد میں سے ہونا چاہیے۔ قائد اعظم نے بتایا کہ اگرچہ وہ عربی متن نہیں پڑھ سکتے لیکن مولانا محمد علی صاحب کا ترجمہ اور دیگر ضروری اسلامی لڑپچان کے پاس ہے جس کا وہ ہمیشہ مطالعہ کرتے ہیں۔ (خبری پیغام صلح لاہور۔ مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۳۲ء)

درس قرآن میں تفسیر ”بیان القرآن“

سے استفادہ

بر صغیر ہندو پاک میں قرآن کریم کا درس دینے والوں نے بھی مولانا محمد علی صاحب کی صحیم اُردو تفسیر ”بیان القرآن“ سے پورا پورا استفادہ حاصل کیا ہے۔ اصل میں یہ عالمانہ تفسیر اسی غرض سے لکھی گئی ہے کہ لوگ قرآن پاک کو خود سمجھ کر پڑھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔ کہنے کو دیوبند کے شدت پسند علماء احمدیت اور اُس کے بانی حضرت مراٹا غلام احمد صاحب قادریانی کے زبردست دشمن ہیں، لیکن درس کے معاملے میں وہ بھی مولانا محمد علی کی تفسیر ”بیان القرآن“ سے استفادہ حاصل کرتے رہے ہیں۔ دیوبند میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی درس قرآن دیا کرتے تھے۔ بنگال کے مولانا آفتاب الدین احمد اُمان کے خاص شاگرد تھے۔ خاص اس لئے کہ وہ بی۔ اے پاس تھے۔ اور پورے دیوبند میں اکیل طالب علم تھے جو انگریزی جانتا تھا۔ قادریانی مبلغ نعمت اللہ خان کی کابل میں سنگساری کیجہ سے مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا محمد علی لاہوری کے نیچے ایک قلمی جنگ چھڑ گئی۔ مولانا شبیر عثمانی کابلی مولویوں کی اس حرکت کو قرآن و سنت کے عین مطابق قرار دیتے تھے۔ جبکہ مولانا محمد علی کا اذعایہ تھا کہ قرآن و حدیث ہر دو سے اس فعل کی قطعاً کوئی تائید و حمایت نہیں ہوتی۔ دونوں اطراف سے اپنے اپنے موقف کی تائید و حمایت میں دلائل اور برائیں پیش ہوتے رہے۔ لیکن بار بار کے اصرار پر بھی مولانا شبیر احمد صاحب اپنے موقف کی تائید میں قران کریم کی ایک آیت بھی پیش نہ کر سکے۔ آخر میں خاموش ہو گئے۔ مولانا آفتاب الدین احمد اس قلمی محاربے کو بڑی سنجیدگی سے دیکھ رہے تھے۔ مولانا شبیر عثمانی کی خاموشی انہیں بری طرح اکھر رہی تھی کیونکہ انہیں اس میں مولانا شبیر عثمانی کے موقف کی ہار نظر آئی۔ شاگرد اور استاد میں اس موضوع

کو لیکر تکرار بھی ہوئی۔ بالآخر مولا نا آفتاب دیوبند کو الوداع کھکر لا ہور چلے آئے اور مولا نا محمد علی کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد وہ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں انگستان چلے گئے، اور نہایت کامیاب مبلغ ثابت ہوئے۔ مولا نا آفتاب الدین احمد کا ایک بیان ”پیغام صلح“، لا ہور میں چھپا ہے۔ اُس وقت مولا نا شیر احمد عثمانی زندہ ہی تھے، انہوں نے کبھی اس بیان کی تردید نہ کی۔ مولا نا آفتاب کہتے ہیں کہ جب ہم کلاس میں مولا نا عثمانی کا درس سنتے تو اُس میں بہت سے ایسے نکات ہوتے جو متدالوں تراجم اور تفاسیر میں موجود نہ ہوتے۔ اس سے ہم پران کی علمیت اور قرآن دانی کی دھاک بیٹھ گئی۔ ایک دن کسی کام کی وجہ سے ہم ان کے بھی کمرہ میں چلے گئے۔ اُس وقت مولا نا عثمانی اپنا لیپکھ تیار کر رہے تھے۔ ایک کتاب ان کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اُس کو بند کر کے دوسری کتاب کے نیچر کھدیا۔ جب ہم نے آگے بڑھ کر وہ کتاب باہر نکالی تو وہ لا ہور کے مولا نا محمد علی کی اردو تفسیر ”بیان القرآن“ تھی۔

شروع شروع میں پاکستان کے غلام احمد پرویز صاحب بھی اپنے درس قرآن میں اسی تفسیر کو سامنے رکھ کر درس دیتے تھے۔ لیکن جب لوگوں کو پہتہ چل گیا، تو ساتھ رکھنا ترک کر دیا۔ محترم پرویز صاحب کا اپنا بیان ہے:

”جب میں نے ”معارف القرآن“ کی طرح ڈالی تو مولوی محمد علی صاحب لا ہوری کا قرآن انگریزی میرے سامنے تھا۔ اسی کے مطابق آجیوں کے نمبر لگائے تھے۔“
(معارف القرآن۔ جلد اول۔ دیباچہ)

پرویز صاحب کی تفسیر میں تو فیصلہ با تیس وہی ہیں جو پہلے سے مولا نا محمد علی کے علم الکلام میں ہیں۔ لندن کے نامور مبلغ اسلام الحاج مولا نا شیخ محمد طفیل مرحوم کا ایک مقالہ اخبار پیغام صلح لا ہور مجریہ ۳ اپریل ۱۹۵۵ء، چھپا ہے۔ جس میں شیخ صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ انہوں نے کراچی میں جناب پرویز صاحب کو حضرت مولا نا محمد علی صاحب کی تفسیر بیان القرآن سے درس قرآن دیتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ پرویز صاحب اس بیان کے شائع ہونے کے بعد کافی سال زندہ رہے لیکن انہوں نے کبھی تردید نہ فرمائی۔

آج کل پاکستان میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درس قرآن کا چرچا ہے (۱)۔ اُن کے متعلق خود انہیں کے استاذ المکرّم مولانا مین احسن اصلاحی کا بیان ہے کہ وہ لاہور کے مولانا محمد علی احمدی کی تفسیر سے خاصے متاثر ہیں۔ اس بات کی جھلک ڈاکٹر اسرار کے درس میں بھی صاف نمایاں ہے۔

ایک ایسا ہی واقعہ خاکسار مولف کو بھی پتہ چلا۔ میں اور پروفیسر نور الدین صاحب زادہ مر حوم کشمیر کے نامور مفتی اور عالم دین مولانا مفتی جلال الدین مر حوم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں مولوی عبدالقدوس صاحب تشریف لائے، یہ صاحب سرکاری سکول میں اردو اور فارسی پڑھاتے تھے۔ گفتگو کا رخ مولانا محمد علی کی شاہکار تفسیر ”بیان القرآن“ کی طرف مڑا۔ دوران گفتگو مولوی عبدالقدوس نے کہا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ درگاہ شریف حضرت بل کشمیر میں واقع ”مدينة العلوم“ کے سربراہ مولانا عبد الکبیر صاحب اپنا درس قرآن تیار کرنے کے لئے مولوی محمد علی لاہوری کی بیان القرآن سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ تفسیر ان کے ڈیکس پر کھلی ہوتی تھی۔ مولوی عبدالقدوس نے کہا کہ میں نے مولانا عبد الکبیر سے سوال کیا کی جناب یہ تو ایک مرزاںی کی تفسیر ہے۔ انہوں نے جواب دیا: ہاں! اختلاف مقامات تو بس گئے چھٹے ہوتے ہیں۔

ہمیں ان سے کیا لینا دینا۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ اس احمدی مفسر نے بعض ایسے نادر اور نایاب کنکے ابھارے ہیں جو ہمارے علماء کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ (فی الحال درس قرآن والے ٹاپک کو ہم بیہیں چھوڑتے ہیں، کیونکہ اس پر مزید بحث آگئے بھی آئے گی)

(۱)۔ جس وقت یہ مقالہ لکھا جا رہا تھا اس وقت ڈاکٹر اسرار احمد زندہ تھے۔ (خوشید)

قدامت پسند علماء کی مخالفت اور بے بنیاد پراپکنڈا

تاریخ مذاہب عالم کے کسی بھی دور کو اٹھا کر دیکھ لیں، جب بھی اللہ کے کسی نیک بندے نے اپنے زمانہ کی بے علمی، جاہلانا رسم و غیر معقول معتقدات کے خلاف آواز بلند کی تو قدامت پسند ہم عصر علماء نے اُس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حتی الامکان عوام کو اُس سے ملنے یا اس کی بات سننے سے باز رکھا۔ اس کا آسان اور کارگر حرہ بہ ہر دور میں ایک ہی رہا ہے۔ وہ یہی کہ مخالف کو کافر یعنی دین کے دائرہ ہی سے خارج فرما دیا جائے۔ اپنے فتویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بہت ساری فرضی اور من گھڑت باتیں فریق مخالف کے ذمہ ڈال دی جاتی ہیں۔ یہی طریقہ مولانا محمد علی لاہوری کے ساتھ برداشت گیا۔ عوام کو بذلن کرنے کے لئے یہی کہا گیا کہ یہ شخص کافر ہے، اس کی تفسیر اور دیگر تصانیف غیر اسلامی باتوں اور غلط معتقدات سے بھری ہوئی ہیں۔ ان سے رہبری کی امید تو دور اٹھا گراہ ہو جانے کا سعید خدشہ ہے۔ لکھا پڑھا آزاد خیال طبقہ چونکہ پہلے ہی قدامت پسند علماء کی پکڑ اور اثر و رسوخ سے باہر ہوتا ہے۔ لہذا مولوی کے وعظ یا پراپکنڈا کا اُس پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ البتہ فرسودہ اور دینوںی نظریات اور معتقدات سے چھٹے رہنے والے، رسم و رواج کے خونگر پڑھے لکھے لوگ علم و عرفان کے اس جدید خزینہ بے بہا سے مدوں بے خبر اور بے نصیب ہی رہتے ہیں۔

ایک وقت وہ تھا جب یورپ کو ان کے عیسائی مشائخ اور علماء یہی بتاتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم - نعمود باللہ) دُنیا کا سب سے زیادہ غیر مہذب، وحشی اور ملک و ملت کا سب سے خطرناک دشمن ہے۔ غلط بیانیوں کا یہ سلسلہ صد یوں تک چلتا رہا۔ لیکن جب عیسائی عوام نے اسلام اور بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور قرآن شریف کا خود مطالعہ کیا، تو انہیں اپنے مذہبی رہنماؤں کی غلط بیانی کا پتہ چلا۔ نتیجہ یہ کہ انہوں نے اپنے مذہبی قائدین اور زعماء کے خلاف آواز

بلند کر دی۔ پہلی زور دار اور موثر آواز مشہور مغربی مفکر تھامس کارل (Thomas Carlyle)

نے 1840ء میں اٹھائی۔ اُس نے اپنی تصنیف & "Heroes & Hero-worship" (جو اصل میں اُس کے لیکھروں کا مجموعہ ہے) میں حضرت محمد صطفیٰ کو دُنیا کا کامیاب ترین انسان بتایا۔ اور کہا کہ ہمارے اسلاف کا کتنا بڑا ظلم اور بہتان ہے کہ تینی اور اخلاق کے اس بے مثال نفس قدسی کو برآبنا کر پیشکرتے رہے ہیں۔ اور ایسے ایسے بے بنیاد اہم اور غلط باتیں اس کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں جن کو اب پڑھ کر ہم شرمسار ہو جاتے ہیں اور ندامت سے ہمارے سر جھک جاتے ہیں۔ اور لکھا کہ ہمیں سب سے بڑا دُکھ اسی بات کا ہے کہ کذب و بہتان کا یہ غلط روایہ انہی لوگوں نے اپنایا جو خود کو سب سے زیادہ ویندا اور پرہیز کا رٹھرا تھے۔

حال ہی میں مائیکل ایچ ہارت (Michael H. Hart) نے "Great" نامی

کتاب شائع کی۔ مصنف عقیدے کے اعتبار سے عیسائی ہے، پھر بھی اُس نے اس لست میں سرفہرست حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو رکھا۔ وجہ بتاتے ہوئے لکھتا ہے :

"My choice of Muhammad to lead the list of world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both religious and secular levels" (P.33)

"میں نے دُنیا کی سب سے زیادہ اثردار ہستیوں کی لسٹ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے اوپر رکھا ہے۔ یہ بات کچھ قاریوں کو حیران کر دے گی، بعض لوگ اس پر سوالیہ نشان کھڑا کر دیں گے۔ لیکن حق یہی ہے کہ ساری تاریخ عالم میں یہی واحد انسان ہے جو مذہبی اور دنیاوی، دلوں ہی اعتبار سے کامیاب ترین ثابت ہوا ہے۔"

یہی بات آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ابن غلام یعنی حضرت مولانا محمد علی صاحب کے ساتھ دوہرائی گئی۔ تنگ نظر اور قدامت پرست علماء نے حضرت مولانا محمد علی کی تفسیروں اور دیگر تصنیفوں کی نسبت بنا پڑھے ہی یہ مشہور کر رکھا تھا کہ ان میں بہت کچھ ایسا ہے جو کہ غیر اسلامی اور گمراہ کن ہے پس مسلم عوام کے لئے ان سے احتراز لازم ہے۔ مثال کے طور پر جمعیت علمائے

ہند کے سابق نائب صدر مولانا اخلاق حسین قاسمی نے آڈی صدی قبل لکھا تھا :

”اردو کی تفسیروں میں محمد علی صاحب مرزاٹی کی تفسیر زمانہ حال کی اچھی تفسیروں میں شمار ہوتی، اگر اس میں مرزاٹیت کے جراائم نہ ہوتے۔ اور مرزا غلام احمد جیسے خطی انسان کی مجددیت کا پروپنڈہ نہ ہوتا۔“

(کتابچہ - مودودی صاحب کی تفسیر پر محققانہ نظر)

سن ۱۹۶۸ء میں دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایک شخصی کتاب بنام ”جائزہ ترجم قرآنی“ شائع ہوئی۔ اسکے صفحہ نمبر ۵ پر ”ترجمہ محمد علی لاہوری“ عنوان کے تحت یہ عبارت ملتی ہے :

”مترجم جماعت احمدیہ کے امیر تھے۔ انہوں نے یہ ترجمہ اپنی تفسیر بیان القرآن کے ضمن میں اپنی جماعت احمدیہ کے لئے اپنے معتقدات کو پیش نظر رکھ کر کیا ہے۔ ترجمہ بلاحظ زبان و انشاء شستہ اور سلیس اور عام فہم عبارت میں ہے۔ مگر چونکہ خاص معتقدات کو محور قرار دے کر بیان القرآن کی تصنیف عمل میں آئی ہے۔ اس لئے عام مسلمانوں کے لئے اس کے مطالعہ میں ضرر کا سخت اندیشہ ہے۔“

یہ غلط بیانی سالہاں سال جاری رہی، لیکن جب بھی اور جہاں بھی کسی منصف مزاج محقق نے پرانی لکیر کو چھوڑ کر اصل حقائق کی خود چھان بیں کی، تو حق بات آپ سے آپ نکھر کر سامنے آگئی۔ ماہنامہ ”اسلامی دامجسٹ“ کراچی پاکستان نے اپنے مارچ 1996ء کے شمارے میں ”تشریح القرآن“ کے عنوان سے قرآن پاک اور اس کے اردو اور انگریزی ترجم کے متعلق نہایت علمی اور خیال آفرین مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میں قرآن شریف کے قدیم اور جدید معروف ترجم اور تفاسیر کا غیر جانب دارانہ تبصرہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ حضرت مولانا محمد علی علیہ الرحمۃ کے انگریزی ترجمۃ القرآن اور تفسیر ”بیان القرآن“ کے متعلق جو تبصرہ کیا ہے۔ اُس کو ملاحظہ فرمائیں:-

”مولوی محمد علی صاحب کی یہ (انگریزی) تفسیر علامہ عبداللہ یوسف علی کی تفسیر سے سترہ سال قبل 1917ء میں شائع ہو چکی تھی۔ اسی لئے علامہ صاحب نے اپنی تفسیر کے دیباچے میں انگریزی زبان کی دوسری تفاسیر کے علاوہ اس تفسیر کا بھی تعریفی انداز میں ذکر کیا

ہے۔ اور لکھا ہے۔

”ابن حنفیہ لاہور نے مولوی محمد علی کی تفسیر مع ترجمہ شائع کی ہے، جو اتنی مقبول ہوئی ہے کہ اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں، یہ ایک محققانہ اور فاضلانہ کام ہے۔ تفسیری و تشریحی مواد بہت مناسب و کافی ہے اور آخر میں جواشاریہ شامل کیا ہے وہ جامع ہے۔“^(۱)

مولوی صاحب کا اسلوب یہ ہے کہ سورت کے شروع میں خلاصہ مضمون لکھتے ہیں۔ اس کے بعد اس کا تعلق کن سورتوں اور آیتوں سے ہے، اس کیوضاحت کرتے ہیں۔ تاریخ نزول اور ترتیب نزول آیات پر بحث کرتے ہیں۔ ربط تعلق کے ضمن میں تین قسم کے ربط تعلق پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اول آیات کا باہمی تعلق، دوم روکوں کا باہمی تعلق اور سوم سورتوں کا باہمی تعلق۔

انگریزی تفسیر و ترجمہ کے پانچ سال بعد اُردو تفسیر و ترجمہ بھی ”بیان القرآن“ کے نام سے شائع ہوا۔ لیکن چونکہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر کا بھی

(۱) شاید تبرہ نگاہ کو یہ معلوم نہیں کہ علامہ عبداللہ یوسف علی انگریزی زبان کے ماہر ترجمے لیکن انہیں عربی نہیں آتی تھی۔ وہ قرآن کے ترجمے کو ازاد نظر (Blank verse) میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب علامہ اقبال مر حوم کو یہ پڑھا چلا کہ یوسف علی صاحب قرآن پاک کا ترجمہ کرنے لگے ہیں تو انہوں نے بے اختیار یہ ریماک پاس کیا : ”جس طرح امام حسینؑ کی ذات مظلوم تھی، اسی طرح آج قرآن کریم مظلوم ہے۔ کیونکہ اس کا انگریزی ترجمہ یوسف علی اور اُردو ترجمہ حکیم احمد شجاع کر رہے ہیں۔“ (پیغام صفحہ ۱۸۴، اکتوبر ۱۹۶۷ء)

شروع شروع میں عبداللہ یوسف علی اپنا مسودہ ترجمہ کیلئے مولانا محمد علی کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ پھر جب لاہور کے اسلامیہ کالج میں پروفیسر سے پرنسپل ہو گئے تو یہ مسودہ بند کر دیا۔ اُن کا ترجمہ پہلے ایک ایک پارہ کر کے چھپتا رہا۔ اُس میں انہوں نے مولانا محمد علی کی طرح وفات مسٹر کا اعلان کر دیا۔ جس پر مولوی لوگ بڑی طرح بگوئے۔ مجبوراً انہیں وہ بات ترجمہ سے خارج کر دینا پڑی۔ دیباچہ کے علاوہ انہوں نے حوشی میں بھی جگہ مولانا محمد علی کوکوت (Quote) کیا ہے۔ اللہ تھسب اور نگل نظری کا راکرے! مکہ معظھ کی مسلم ولڈ لیگ نے علامہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ بعض تفسیر و بارہ شائع کیا۔ اس میں علامہ یوسف علی کا رقم فرمودہ دیباچہ توحذف ہے تھی اس کے علاوہ اُن تمام عبارتوں کو جن کرف نہیں سے نکال دیا گیا ہے جن میں حضرت مولانا محمد علی کی انگریزی تفسیر کا حوالہ دیا گیا ہے۔ کسی وفات یا وقت خصیت کی تصنیف میں اس طرح کی کتریونت اور بے جا تصرف غیر قانونی ہی نہیں غیر اخلاقی بھی ہے۔ اس طرح تو کسی بھی تصنیف یا کتاب کی اصلاحت باقی ہی نہ رہے گی، ایک دم مشکوک ہو جائے گی۔ اللہ کی شان! یہ سب کرنے کے باوجود کتابیات (Bibliography) والے صفحہ پر حضرت مولانا محمد علی کی انگریزی تفسیر قرآن کا نام موجود ہے۔ (خورشید)

یہی نام ہے اور شہرتِ عام بھی اس کے حصے میں آئی۔ اس لئے یہ تفسیر مولوی محمد علی کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صالح اس تفسیر و ترجمہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں (۱) :-

”ترجمہ سلیس ہوتے ہوئے ادبی متانت لئے ہوئے ہے۔ لسانی حیثیت سے فصاحت اور شستگی ہے۔ معنوی لحاظ سے کئی لوگوں کو ان کے عقائد اور خیالات کی وجہ سے ان کے ترجمہ و تفسیر پر اعتراض ہے۔ دراصل وہ جماعت احمدیہ، لاہوری گروپ کے امیر تھے اس کے باوجود ہمارے خیال میں ان کا ترجمہ و تفسیر ”غلط عقائد“ کی ترجمانی سے تقریباً خالی ہے۔ انہوں نے بڑے محتاط ہو کر، بڑے خلوص سے اور رائے عام کو منظر کھتے ہوئے یہ ترجمہ لکھا ہے۔ نص قرآن اور ترتیب الفاظ کا خیال رکھنے کے باوجود ترجمے میں روانی اور تسلسل قائم ہے (۲)،“ (اسلامی ڈاگبکٹ کراچی، مارچ 1996ء)

عثمانیہ اکیڈمک ٹرست کراچی نے 1994ء میں پروفیسر ڈاکٹر محمد نسیم عثمانی کی ایک عالمانہ تخلیق ”اردو میں تفسیری ادب : ایک تاریخی اور تجزیاتی جائزہ“ شائع کی ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے حضرت مولانا محمد علی علیہ الرحمۃ کی اردو تفسیر بیان القرآن کے متعلق جو تبصرہ کیا ہے، اس کو ہم نیچے میں دوں قارئین کرام کی نذر کر رہے ہیں:

”یہ ترجمہ و تفسیر، مولانا اشرف علی تھانوی کی مشہور تفسیر ”بیان القرآن“ سے مختلف ہے۔ اس کے لکھنے والے لاہوری جماعت احمدیہ کے امیر مولانا محمد علی ہیں۔ اس تفسیر کو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے شائع کیا ہے۔ مولانا محمد علی نے ابتدأ قرآن کریم کا ترجمہ

(۱) یاقوب اس ”قرآن حکیم کے اردو ترجم“ از ڈاکٹر صالح عبد الحکیم شرف الدین۔ ص 325 سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب شرف الدین اینڈ سز میں شائع کی ہے۔ نیٹ پر دستیاب ہے۔ (خورشید)

(۲) غیر جانبدارانہ و مقتضانہ رائے تو آپ نے پڑھ لی اب تکسب میں ڈوبی یہ عبارت بھی ملاحظہ فرمائیں:-
”کیا بجا طریقی اور کیا باعتبار از بیان (مولوی محمد علی لاہوری کی بیان القرآن۔ نقل) ایسی پھیسی پھیسی کتاب شاید ہیں ملے۔ یہی حال ان کی اور تصنیفات کا ہے۔“ (طیوع اسلام، دسمبر 1953ء)

یہ الفاظ کسی جاہل یا بے علم مولوی کے نہیں بلکہ ہندوپاک کے مشہور جریدہ ”طیوع اسلام“ کے روشن خیال مدیر محترم کے رقم فرمودہ ہیں۔ إِنَّ اللَّهَ وَإِنَّا لِلَّهِ رَاجِحُونَ۔ (خورشید)

تفسیر انگریزی زبان میں کیا تھا، لیکن پھر اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی غرض سے اس کو اردو میں منتقل کیا تھا۔ چونکہ اردو میں تفسیر کو زیادہ پھیلا کر بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو تین جلدیوں میں چھاپا گیا تھا۔ یہ ایڈیشن 1924ء تک کے عرصہ میں شائع ہوا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد اس کے تین ایڈیشن ایک ایک جلد میں شائع ہوئے۔ یعنی 1969ء، 1972ء اور 1980ء میں۔ اس کو نہایت اہتمام سے چھاپا گیا۔ مترجم و مفسر خود تمہید میں فرماتے ہیں:-

”وہ مقدس پیغام (قرآن کریم) ان لوگوں کی زبان میں نازل ہوا، جنہوں نے دنیا میں اس کے حامل بننا تھا۔ مگر آج اس عالم کے مختلف اطراف واکناف میں رہنے والے مسلمان اس زبان سے نا آشنا ہیں اور بہت ہیں کہ اس پیغام کو پڑھتے ہیں مگر انہیں علم نہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس پیغام کی غرض یہ ہے کہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں اور غلط راہوں کو چھوڑ کر اپنی دینی اور دُنیوی فلاح کا صحیح راستہ اختیار کریں تو اس کا مطلب سمجھے بغیر وہ غرض حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں نے جب تبلیغ اسلام کی ضرورت کو منظر رکھتے ہوئے انگریزی میں اس پاک کلام کے ترجمہ اور مطلب کو بیان کیا تو بہت سے احباب نے یہ اصرار کیا کہ اردو زبان میں بھی اپنے اہل ملک کے فائدہ کے لئے اسے شائع کیا جائے۔ مگر یہاں کی ضروریات کو منظر رکھتے ہوئے ازسرنو کام کرنا پڑا۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ ہر ایک مسلمان قرآن کریم کو پڑھے اور اس کے مطلب پر آگاہ ہو کر اپنی روزمرہ زندگی میں اور مشکلات پیش آمدہ میں اپنا ہادی اور رہنمہ بنائے۔ اس راہ کو اختیار کئے بغیر مسلمان کبھی موجودہ مشکلات سے باہر نہیں نکل سکتے۔“

آگے چل کر مترجم و مفسر جناب محمد علی فرماتے ہیں:-

”اس ترجمہ اور ان حواشی میں ایک بات کی طرف بالخصوص توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ قرآن کریم سے اجنبیت نے جن دلوں میں یہ خیال پیدا کیا ہے کہ اس

پاک کتاب کے مضامین میں کوئی ترتیب نہیں، انہوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ موجودہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی وی سے ہے اور یہ ایک ابلغ اور محکم ترتیب ہے۔ مخالفین میں غور و خوض کی کمی نے بے ترتیبی کا خیال پیدا کیا۔ یہاں تک کہ اس زمانہ میں ایک مسلمان نے بھی ان خیالات سے متاثر ہو کر ایک ترتیب نزول اپنے پاس سے بنایا کہ قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے^(۱)۔

غرض مترجم و مفسر نے سطور بالا میں جو خیالات پیش کیے ہیں وہ مسلمانوں کے سوا اعظم سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ بلکہ دیکھا جائے تو اس میں (قادیانی خلیفہ) مرتضیٰ بشیر الدین محمود (احمد) کی تفسیر صغیر سے نمایاں فرق نظر آئے گا۔ اس فرق کو جانے کے لئے مندرجہ ذیل آیات کا ترجمہ اور تفسیر ملاحظہ کیجئے:

”مَا كَانَ مُحَمَّدًا أَبَا أَحَدِهِنْ رِجَالُكُمْ وَلَكِنَّ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا۔ (۳۳:۲۰)

ترجمہ: محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانے والا ہے۔

تفسیر: خاتم النبیین کی تفسیر احادیث نبوی سے : خاتم النبیین کے معنی لغت

(۱) یہ انگریزی ترجمہ مولانا مرزا ابوالفضل نے کیا تھا۔ جس کو 1911ء میں اصغر ایڈیشنی ال آباد نے بعث عربی متن شائع کیا۔ اس کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ آج یہ قدیم میوزیوں میں بھی کیا جاتا ہے۔ وفات سے قبل یعنی پچاس کے دہائے میں مرزا ابوالفضل نے قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ (بلاعربی متن) شائع کیا۔ جس میں قرآنی سورتوں کی عام متداوی ترتیب و برقرار رکھا گیا ہے۔ اس ترجمہ میں صرف ایک تینی فٹ نوٹ ہے۔ جس میں حضرت عیینی اور ان کی والدہ محترمہ کے شیعی طرف بھرت کرنے کا ذکر ہے۔ اخیر پر عربی الفاظ کی فہرست شامل ہے۔ جس میں ”معنی“، عنوان کے تحت حضرت عیینی کے صلیب سے زندہ قیمتی اور پھر بعد وفات شیعی میں دفن ہونے کا اقرار ہے۔ اس سلسلے میں وہ ایک حدیث بھی لائے ہیں۔ جس میں حضور نے فرمایا کہ حضرت عیینی 125 سال کی عمر میں وفات پائے۔ مرزا ابوالفضل نے ”غريب القرآن في اللغات الغرقيان“، نام سے قرآن کی ایک عمدہ لغت بھی شائع کی ہے۔ اس میں بھی وفات متع کا اقرار موجود ہے۔ چنانچہ آیت اللہی رَبُّوَّذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ۔ (سورت 23 آیت 50) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”ایسی بلند سرزین میں جہاں میوں کی افراط ہے اور نہیں جاری ہیں۔ یہ بیان ہے اس سرزین کا جہاں صلبی کا روائی کے بعد حضرت مسیح اور ان کی والدہ ماجدہ کو پناہ ملی۔ مولوی محمد علی اپنے ترجمہ قرآن مجید میں یہ مقام کشمیر کو قرار دیتے ہیں۔ اور اس میں نہ کہ آنحضرت کے تاریخی حالات بھی اس کے معاون ہیں۔ (غريب القرآن - ص 126) (خوشید)

سے اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ انبیاء علیہما السلام ایک قوم ہیں اور کسی قوم کا خاتم یا خاتم ہونا صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے۔ یعنی ان میں سے آخری ہونا۔ پس نبیوں کے خاتم کے معنی نبیوں کی مہربنیں بلکہ آخری نبی ہیں۔ یہاں ان سب احادیث کے نقل کرنے کی کنجائش نہیں جن میں خاتم النبیین کی تشریح کی گئی ہے۔ یا جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی کانہ آنا بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ احادیث متواترہ ہیں۔ جو صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے مروی ہیں۔ اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی نہیں۔” (اردو میں تفسیری ادب، ص ۴۱۶، ۵۱۶) بہاول پوروالے تاریخی مقدمے میں، جو قادیانیوں کے خلاف تھا، دیوبندی علماء نے اپنے بیان میں حضرت مولانا محمد علی لاہوری کی ماینائز تفسیر ”بیان القرآن“ کو بھی بطور سند پیش کیا تھا :

”قرآن مجید میں ہے وَلِكِنْ رَسُولُ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ۔ اس آیت کی تفسیر میں مولوی محمد علی لاہوری نے جلد سوم ص ۱۵۱ میں لکھا ہے کہ خَاتَمَ النَّبِيِّينَ کے معنی لغت سے اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ اور کسی قوم کا خاتم یا خاتم ہونا صرف ایک ہی معنے رکھتا ہے۔ یعنی ان میں سے آخری ہونا۔ پس نبیوں کے خاتم ہونے کے معنے نبیوں کی مہربنیں۔ جیسا کہ قادریانی کہتے ہیں۔ بلکہ آخری نبی ہیں۔“

(بیانات علمائے ربانی برادری افرقۃ قادریانی۔ ص ۱۳۔ ناشر مکتبہ رشاد دیوبند)

نامور اکابر علماء کی آراء

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم

حضرت مولانا محمد علی صاحب کے انگریزی ترجمہ تفسیر قرآن کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے کچھ تحریری بیان ہم اور نقل کرائے ہیں۔ سن ۱۹۶۶ء میں مشہور اردو ماہنامہ ”نظام“ کانپور نے ایک نہایت معلوماتی ”قرآن نمبر“ نکالا۔ جس میں ملک کے نامور علماء اور فضلاء کے مقابلے شامل کئے گئے۔ اس خصوصی نمبر کے لئے مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی ایک مقالہ رقم فرمایا تھا، جس میں وہ لکھتے ہیں :

”ادھر یہ سب ہو رہا تھا کہ ادھر لا ہو رہا 1918ء میں ایک خاص اہتمام کے ساتھ ایک نیا ترجمۃ القرآن حامل المتن مع حواشی تفسیری نکلا۔ یہ ترجمہ مولوی محمد علی ایم۔ اے امیر جماعت احمد یہ لا ہو رکے قلم سے تھا۔ اور یہ انگریزی ترجموں کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تفسیری ترجمہ جدید انگریزی خوان جماعت کی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا تھا۔ اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں خوب مقبول ہوا۔ غیر مسلموں میں بھی اس کی مانگ اچھی ہوئی۔ اور مدت توں یہی ترجمہ باہر والوں کی نظر میں اسلامی حیثیت سے منتسب ہجھا جاتا رہا۔

اس کے شروع میں ایک مفصل دیباچہ ہے جس میں اصول دین و عقائد و احکام شریعت سب ضروری تفصیل کے ساتھ آگئے ہیں۔ غیر مسلموں کو اسی کے ذریعہ سے پوری واقفیت اور راہنمائی اسلام کے متعلق ہو جاتی ہے۔ پھر ہر سورت کے شروع میں سورۃ کے مضامین و مباحث سے متعلق ایک سلسلہ ہوا مقدمہ ملتا ہے۔“

(ماہنامہ ”نظام“ کانپور ہند۔ قرآن نمبر۔ مضمون ”قرآن کے انگریزی ترجمہ۔“)

اب حضرت مولانا محمد علی صاحب لا ہو ری کی ماہنامہ ناز اردو تفسیر ”بیان القرآن“ کے بارے میں مولانا دریابادی کی رائے ملاحظہ فرمائیں :-

”محمد علی لاہوری کی انگریزی تفسیر قرآن..... اور سب سے بڑھ کر ان کی اردو تفسیر بیان القرآن، تین جلدیوں میں بحیثیت مجموعی بڑی قابل قدر ہے۔ اسلام اور قرآن کی حقانیت کا نقش دل پر ثابت کر دینے والی۔“

(معاصرین۔ ص 43۔ طبع اول 1979ء)

ایک اچھی اور کامیاب تفسیر کی خوبی یہی ہے کہ وہ قاری کے دل و دماغ پر اسلام اور قرآن کی صداقت کچھ اس طرح ظاہر کر دے کہ اس کا اثر اور نقش ہمیشہ کیلئے ثابت ہو کرہ جائے۔

حافظ غلام سرور (مترجم قرآن بربان انگریزی)

اپنے انگریزی ترجمۃ القرآن کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

”مولانا محمد علی صاحب نے سابقہ مترجموں کی بیسوں غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔ اور جہاں بھی انہوں نے اختلاف کیا ہے وہاں ان کا ترجمہ یا تو بالکل درست و صحیح ہے یا ان کے ترجمہ کی بنیاد و اساس عربی زبان کی مستندیات پر ہے۔ ہمارے اس بیان سے کوئی یہ نتیجہ نہ نکال لے کہ مولانا محمد علی نے (نحوہ باللہ) قرآنی الفاظ کو نئے معنی پہنانے ہیں۔ اگر قاری عجلت اور جلد بازی سے کام نہ لے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ مولانا موصوف ایک بلند پایہ عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم محقق بھی ہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ مولانا موصوف کے بعض حواشی میں ندرت یا نیا پان موجود نہیں۔ لیکن یہ کوئی نقش یا عیب کی بات نہیں۔ کوئی بھی شخص جو قرآن پاک کی ترجمانی میں پوری دیانتداری اور کامل خلوص سے کام لے گا۔ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تحقیق و مطالعہ کے نتائج کو کھل کر بیان کرے۔ ترجمہ کی لکھائی اور چھپائی غیر معمولی طور پر دیدہ زیب اغلاط و استقام سے پاک ہے۔ یہ ترجمہ شروع سے اخیر تک مولانا کی قرآن کے تیس والہانہ عقیدت اور فریفتگی کا غماز ہے۔ اس عمدہ شاہکار کے لئے مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی مولانا محمد علی کے ہمیشہ رہیں احسان رہیں گے۔“

(Translation of the Holy Qur'an, page xxxvii)

امر ترکا معتبر اور مشہور اخبار ”وکیل“

اس اخبار کو فخر حاصل ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ عبداللہ العمامدی جیسے نامور اہل قلم و اصحاب علم و فضل اس کے مدیرہ چکے ہیں۔ 5 راپریل 1919ء کے شمارے میں ”کتاب مبین“ کا انگریزی ترجمہ۔ ایک زرین دکامیاب کوشش“، کے عنوان کے تحت مدیر محترم کا ایک بے لائگ شاندار تبصرہ چھپا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں:-

”تین چار سال پیشتر ان کا لمون میں تراجم قرآن کاذکر کیا گیا تھا۔ جو مختلف از منہ میں دُنیا کی مختلف زبانوں میں کئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان تراجم کا بھی حوالہ دیا گیا تھا، جو خود مسلمانوں نے علاوہ مشرقی زبانوں کے مغربی اور بالخصوص انگریزی زبان میں کئے۔ 1905ء میں ڈاکٹر عبدالحکیم خان نے 1911ء میں مرزا ابوالفضل نے ایک انگریزی ترجمہ علامہ شبیل نعمنی مرحوم کی تحریک سے نواب عباد الملوك بہادر نے شروع کیا تھا۔ لیکن یہ ترجمہ تمکیل پذیر نہیں ہوا۔ ایک انگریزی ترجمہ انجمن ترقی اسلام قادریان نے 1915ء میں علیحدہ علیحدہ پاروں میں شائع کیا تھا۔ (اس کا صرف ایک ہی پارہ شائع ہوا تھا۔ خورشید) ترجمہ و تفسیر دونوں عمدہ ہیں۔ مگر فرقہ بندی کی روح جا جا نمایاں ہے۔

ان سب سے زیادہ مکمل وہ انگریزی ترجمہ ہے جو مولوی محمد علی صاحب ایم، اے۔ ایل ایل بی، صدر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ ظاہری اور معنوی خوبیوں سے لبریز ہے۔ اس کی مراکشی چڑھے کی سیاہی مائل سبز جلد جو نرمی اور پائپاری کے دو گونہ اوصاف رکھتی ہے۔ معاپنے زرین طغرا کے نہایت دلفریب معلوم ہوئی ہے۔ خود متن، ترجمہ اور تفسیر اعلیٰ پایہ کے انڈیا پیپر پر شائع ہوئی ہے۔ اور انڈیا پیپر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہلکا، مہیں، سفید اور مضبوط ہوتا ہے۔ اور اگر ایسا کاغذ کی تحریر سے مزین ہونے کا حق رکھتا ہے تو وہ خدا کے پاک کلام کی تحریر ہے۔ انڈیا پیپر پر کلام اللہ کا نقش دیکھنے والے کے دل میں روحانیت کا غیر معمولی جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ اور انسانی فطرت اس کے حسن سے ممحور ہو کر سر بسجود ہونے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہ حالت ہم پر طاری ہوئی جب ہم نے زیر نظر کی تلاوت شروع کی۔

نہیں کہ روحانیت کا جذبہ حسن طاہری کا محتاج ہے۔ لیکن کیا اس میں شک ہے کہ حسن طاہری حسن معنوی میں چار چاند لگادیتا ہے۔ پڑھنے والے کی نظر ان طاہری اوصاف سے کمزور کرسب سے پہلے ترتیب مطالب پر پڑتی ہے۔ مقدمہ جو 95 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ دو حصوں میں منقسم ہے۔ (۱) تعلیمات قرآن۔ (۲) جمع و ترتیب قرآن۔ ان مطالب کی تشریح و توضیح میں فاضل مترجم نے تعلیمات قرآن کو گویا ”دریا پر کوزہ“ کر دیا ہے۔ ہماری یہ رائے ہے اور اس میں کسی قسم کی عقیدتمندی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ کہ اگر غیر مذاہب کے لوگ ان صفات کو تعصّب کی آلاتشوں سے پاک ہو کر بڑھیں تو مذہبی ذہنیا کے خیالات میں بہت کچھ تغیر و واقع ہو جائے۔

تشریح طلب الفاظ کی فہرست اور فہرست مطالب بالترتیب حروف تہجی نے قرآن کے مطالب تک رسائی کو بالکل آسان بنادیا ہے۔ ہر سورہ کے شروع میں تمہیدی نوٹ دیتے گئے ہیں۔ ہر سورہ کے متن کے بالمقابل انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے۔ اور ذیلی حوالی میں ان کی تفسیر دی گئی ہے۔ ان سب کی ترتیب قابل تعریف ہے۔ ترجمہ کو تم نے حاجا نظر امعان دیکھا ہے۔ اور اس پر کامل غور کے بعد ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں ہے کہ اس کی سادگی۔ سلاسل روانی اور صحت قبل رشک ہے۔ تفسیر کو حیرت انگیز بے طرفداری کے ساتھ فرقہ بندی کی الجھنوں سے پاک رکھ کر، عام اور مستند اسلامی خیالات کو اس میں فراہم کیا گیا ہے۔ اور مخالفین کے اعتراضات کا جواب دینے میں جدید آلات مدافعت سے کام لیکر صواب اندیشی و مصلحت بنی کاشوت دیا گیا ہے۔

(بحوالہ ”افکار محمد علی“، جلد 5۔ ص 210 تا 211۔ طبع اول)

مولانا عثمانی غنی طاہر

”مکتبہ الحسنات، ہند کے نامور عالم دین مولانا عثمانی طاہر اپنی نہایت مفید و معلوماتی تالیف ”معلومات قرآن“ میں ”قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ“ عنوان کے تحت حضرت مولانا محمد علی کا ذکر خیر یوں فرماتے ہیں:-

” لاہور سے 1918ء میں ایک خاص اہتمام کے ساتھ ایک نیا ترجمۃ القرآن

حامِ امتن مع حواشی تفسیر نکلا۔ یہ ترجمہ مولوی محمد علی ایم، اے۔ امیر جماعت احمدیہ لاہور کے قلم سے تھا۔ یہ تفسیری ترجمہ جدید انگریزی خوان جماعت کی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا تھا۔ اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں خوب مقبول ہوا۔ غیر مسلموں میں بھی اس کی مانگ اچھی خاصی ہوئی اور مدتیں یہی ترجمہ باہروالوں کی نظر میں ”اسلامی“ حیثیت سے مستند سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس کے شروع میں ایک بڑا مفصل دیا چاہے۔ جس میں اصول دین و عقائد و احکام شریعت سب ضروری تفصیل کے ساتھ آگئے ہیں۔ اور غیر مسلموں کو اسی کے ذریعے سے پوری واقفیت اور رہنمائی اسلام کے متعلق ہو جاتی ہے۔ پھر ہر سورت کے شروع میں سورت کے مضامین و مباحث سے متعلق ایک سلسلہ ہو امقدمہ ملتا ہے۔ صفحے کے دو کالموں میں دابنے میں متن قرآن درج ہے اور با میں کالم میں آیت کا نمبر ڈال کر اس کا انگریزی میں ترجمہ ہے۔ نیچے کے حصے میں تفسیری حواشی درج ہیں۔ ”احمدیت“ ان حواشی میں زیادہ نہیں، بالتبہ ”سید احمد خانیت“ اچھی خاصی موجود ہے۔ یعنی مجرمات و خوارق کی تاویلات۔ اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اور 1938ء میں اس کا اختصار بھی شائع ہو چکا ہے۔ یعنی محض ترجمہ بہ حذف تفسیری حواشی۔

(معلومات قرآن۔ ص 186، 187، 192، 1992ء)

اسی کتاب کے صفحہ 188 پر لکھا ہے کہ مصنف ہذا نے بھی قرآن پاک کا ایک ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ جس کی تیاری میں انہوں نے کپٹھال اور مولا نامہ علی کے تراجم سے بھی استفادہ کیا۔ ترجمہ کا کام 1933ء میں شروع ہوا اور 1939ء کے آخر میں مکمل ہوا۔ لیکن چھپنے کی نوبت 1960ء میں آئی۔

الازہر مصر کے نامور عالم امیر شکیب ارسلان مرحوم

”میں کہتا ہوں کہ ان میں سے بہت سی ضروریات کو پورا کرنے میں ہندوستان کے علماء کو یہ بیضاء حاصل ہے۔ ان میں سے (سید) امیر علی ہیں جنہوں نے انگریزی میں مستند کتب تالیف کر کے حقیقتِ اسلام کو جیسا چاہئے تھا، بیان کیا ہے۔ ان میں مولوی محمد

علی امیر جماعت احمدیہ لاہور بھی ہیں۔ یہ جماعت قادیانی نہیں ہے۔ جنہوں نے سنت اور جماعت کی مخالفت کی ہے۔ آپ نے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی تفسیر قرآن انگریزی زبان میں تالیف کی ہے۔ جو اس ترجمہ قرآن کے بعد ہے جو انگریزی زبان میں سب سے زیادہ صحیح ثابت ہوا ہے۔ ان میں مولوی صدر الدین برلن کی جدید مسجد کے بانی ہیں۔ جو مسلمش رویوی کی المانوی (جرمن) زبان ہی ادارت بھی کرتے ہیں۔ آپ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے جرمی کے ایک ادباء اور ادیبات کو قبول اسلام کا شرف عطا کیا۔“

(خبر پیغام صلح لاہور۔ 21 راکتوبر 1939ء)

انجمن حمایت اسلام لاہور

یہ ہندوپاک کے مسلمانوں کی ایک قدیم ترین انجمن ہے۔ اس کی بنیاد 1885ء میں رکھی گئی۔ اس انجمن نے برصغیر کے مسلمانوں کی مادی اور دینی ترقی اور فلاح و بہبود کے بہت سارے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ اس کے آفیشل آرگن ”انجمن حمایت اسلام“ میں بھی حضرت مولانا محمد علی کے انگریزی ترجمہ قرآن و تفسیر پر ایک مبسوط تبصرہ چھپا ہے۔ جس کا خلاصہ اخیر کی ان دو سطروں میں آجاتا ہے:

”مولانا محمد علی صاحب کے انگریزی ترجمۃ القرآن میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک ترجمہ میں ہونی چاہئیں۔ اس ترجمۃ القرآن کی زبان غایت درجہ سلیس اور شستہ ہے۔“ (رسالہ ”انجمن حمایت اسلام“ لاہور۔ 12 نومبر 1935ء)

ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم

ان کے بارے میں خود ان کے استاذ المکرّم مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کا یہ بیان ہے۔ ”میں نے اس کی تحریروں سے یہ اندازہ کیا ہے کہ یہ محمد علی لاہوری (قادیانی) کے ترجمہ قرآن اور قادیانیوں کے نظام سے بہت متاثر ہے۔ (یہ امر واضح ہے کہ) اس نے اپنے رسالہ میں قادیانیوں کی خدمتِ قرآن کی تعریف کی

ہے۔” (رسالہ ”بیانق“، اگست 1978ء۔ ص-7)

ڈاکٹر صاحب موصوف کالا ہوری احمد یوس کے متعلق ذاتی فتویٰ یہ ہے:-

”قادیانیوں کا معاملہ صاف ہوتا بھی لا ہوری احمد یوس کا معاملہ اس قدر صاحب نہیں ہے۔ چونکہ وہ مرتضیٰ غلام احمد صاحب کو صرف ایک مجدد مانتے ہیں۔ اور اس بناء پر انکی تفیر کسی طرح صحیح نہیں۔“

(کتاب ”تحریک جماعت اسلامی۔ ایک تحقیقی مطالعہ“، ص 190، ڈاکٹر اسمار احمد)

مولانا عبدالجید خان ایڈیٹر رسالہ ”مولوی“

”ایک ترجمہ مولوی محمد علی صاحب ایم اے امیر جماعت احمدیہ نے کیا ہے۔ جو بڑے اہتمام کے ساتھ 1917ء میں انجمن احمدیہ لا ہور کی طرف سے شائع ہوا۔ یہ ترجمہ ہر اعتبار سے قبل تعریف ہے۔“ (ماہنامہ ”مولوی“، جمادی الثانی 1366ھ)

علامہ رحمت اللہ طارق

علامہ رحمت اللہ طارق عصر حاضر کے ایک بہت بڑے قرآنی سکالر ہیں۔ قرآنی علوم قدیمہ و جدیدہ پر اُن کی بڑی گہری نظر ہے۔ جو بھی لکھتے ہیں پوری چھان بین اور محققانہ ریسرچ کے بعد ہی لکھتے ہیں۔ ان کی تشریحات اور بیان علی العوم بے لائگ اور غیر جانب دارانہ ہوتے ہیں۔ بہت ساری اعلیٰ پاپیہ کی تصنیفات کے مصنف ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ اہم اور مقبول ”تفسیر منسون القرآن“ ہے۔ یہ کتاب ”ناجح منسون“ والے مسئلے پر حرف آخر کہلانے کی حقدار ہے۔ کیونکہ اس میں اُن پانچ سو آیات پر مدل بحث ہے جن کو بدقتی سے منسون مان لیا گیا تھا۔ امام سیوطی پانچ سو کی تعداد کو کم کر کے بیس تک لے آئے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس تعداد کو مزید گھٹا کر پانچ کر دیا اور لکھ دیا کہ فقط یہی پانچ آیتوں منسون ہیں۔ بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ حضرت مرتضیٰ غلام احمد صاحب اور انکے تبعین نے حضرت شاہ ولی اللہ ولی پانچ آیتوں میں بھی تطبیق کر دکھائی اور بتا دیا کہ سارے کاسارا قرآن غیر منسون اور واجب اعمال ہے۔ احمدیہ یہ پھر میں مسئلہ ”ناجح منسون“ پر خاصاً مواد پہلے سے دستیاب ہے۔ لیکن علامہ رحمت اللہ طارق کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے ”مسئلہ ناجح منسون“ کی پوری تاریخ یکجا کر دی ہے۔

طارق صاحب کی ایک اور غیر معمولی اور قبل قدر تالیف ”تفسیر برهان القرآن“ ہے۔

کتاب کے سرورق پر تعارفی رنگ میں یہ عبارت درج ہے:-

”یعنی اس حقیقت کے اظہار میں کہ قرآن کریم کی آیات میں کوئی تضاد یا

تناقض نہیں۔ بعض مزاعم دلائل و تصورات کی انقلاب آفرین تحقیق۔“

سرورق ہی پر کتاب کے مندرجات کی تفصیل ملتی ہے:-

”جس میں عربی زبان و ادب کے قدیم و جدید علماء اور محققین اور ماہرین لغت عربی کی تحقیق و تدوین کے تناظر میں قرآن حکم کے ان سینکڑوں واضح و متعین فیصلوں کے تفصیلی تجزیے ہیں۔ جنہیں بعض فقہا اور محدثین نے اپنے خود ساختہ عقاائد یا تصورات کے خلاف پاکر کا عدم قرار دے دیا تھا۔ قرآن کریم کے حکم ہونے اور تضاد و تناقض نیز شایدہ تنشیخ سے یکسر یا کہونے کے مسئلے میں برهان قاطع مطالب قرآنی کی تفصیل اور احکام قرآن کی جو ہری تیخیص میں انسانی جہد و تحقیق کا لازوال شاہکار۔“

اس شاہکار میں محترم طارق صاحب نے حضرت مولانا محمد علی کو مصر کے مفتی محمد عبدہ اور امام الحنفہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ہم پائیہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے بھی اپنی ماہ ناز تفسیر ”بیان القرآن“ میں ایسے ایسے اعتراضات کامل اور مسکت جواب دے دیا ہے۔ جو ہمارے مفسرین کو نظر ہی نہیں آتے۔ کتاب میں طارق صاحب حضرت مولانا محمد علی کو محقق محمد علی کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ بعض جگہ ان کی رائے کو سب پر فالق بھی مانا ہے۔

طارق صاحب کو یہ معلوم تھا کہ مولانا محمد علی صاحب احمد یا ٹھمن اشاعت اسلام لاہور کے امیر تھے جو عام معاصر علماء کی نظر میں کافر بلکہ اکفر ہیں۔ اس کے باوجود طارق صاحب نے مولانا محمد علی کے علم و فضل، فکر و شعور سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وجہ بتاتے ہوئے علامہ طارق لکھتے ہیں:-

”میں نے فکر و شعور سے آرائستہ لوگوں کے در پرستک دی اور ان سے طالب

رہنمائی ہوا۔ اور یہ نہ دیکھا کہ جسے شعور کی امانت و دیعت کی گئی ہے وہ کون ہے۔

کیوں کہ میرے پیش نظر حضرت علی کا یہ زریں مشورہ تھا کہ لاتنظروا الی من قال

بل انتظروا الی مقال۔ کہنے والے کو مت دیکھو اس کے کہے پر نظر رکھو۔ اس

طرح یہ مشورہ سچی رہنمائی کرتا ہے۔ کہ یہاں پسند و ناپسند ذاتی مسئلہ بن جاتا ہے۔“

اور طے کردہ نظریات والے ہرگز نہ چاہیں گے کہ جن کو وہ پسند نہیں کرتے ان کے حوالے سے بات چلائی جائے۔ لیکن کیا وحی الٰہی ان کی مغلوب سوچ کی تائید کرتی ہے۔ قرآن فرماتا ہے۔ لَا يَعْجُرْ مَنْكُمْ شَاءُونَ قَوْمٌ عَلَى الَّا تَعْدِلُوا إِعْدِلُوا ہُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ۔ (یعنی) کسی گروہ کی ذاتی پر خاش یا اس سے نفرت کا جذبہ تمہیں ایسا نہ کرنے دے کہ تم تعصب اور مخالفت کی راہ چل پڑو اور اس طرح حق و انصاف کا دامن چھوڑ بیٹھو (نہیں) تم حق و انصاف کا ساتھ دو (خواہ کہیں بھی ہو) کہ خود حفاظتی اور تقویٰ کا صرف یہی ایک راستہ ہے (مفہوم از مائدہ۔ ۹۸-۹۷) اسی طرح نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے۔ الحکمة ضاله المومن حیث وجدها اخذها۔ حکمت یعنی جو ہر فرزانگی مومن کی میراث ہے وہ اسے جہاں پائے حاصل کر لے (المحدث)۔ یہاں حیث کا لفظ مکان اور شخصیت کا ظرف ہے۔ یعنی جس سے اور جہاں سے حکمت کے موتی ملیں انہیں لینے میں تامل نہ کرنا چاہیے مکہ ہو یا ہر دوار۔ گوتم بدھ ہو یا مسیح علیہ السلام "حیث" کا لفظ سب کو شامل ہے۔ نیز فرمایا۔ خذ ما صفا و دع ما کدر۔ ستر استھرا لے او اور گدلا گدلا چھوڑ دو۔ ”

یہاں علامہ طارق نے ایک فٹ نوٹ لکھا ہے۔ جو ہر لحاظ سے سبق آموز اور قابل دید ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

”(نفرت اور تعصب والی سوچ کے حامل حضرات بھی) بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ اہل حدیثوں کے منظلم اور مائیہ ناز عالم مولانا حنفی ندوی ایک مقام پر لکھتے ہیں: ”محمد اسد نے انگریزی زبان میں قرآن کے متن اور پیغام کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔ اور اس میں اُن تمام شکوک و شبہات کو دور کیا ہے۔ جو مغربی ذہن میں قرآن فہمی کے سلسلے میں ابھرتے اور لکھتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش اس لحاظ سے تحسین کے لائق ہے کہ اس نے ہمیں مولانا محمد علی لاہوری کے ترجمہ قرآن سے یکسر بے نیاز کر دیا ہے۔“

(مقدمة ترجمان القرآن ازندوی طبع اسلامی اکڈی یونی لاہور۔ جلد 3، 12، 1، 3 نوشتہ 1982ء 14.3.1982)

یہاں ان کو اعتراف ہے کہ مولانا محمد علی سے نفرت ہی سہی تاہم محمد اسد سے پہلے ان

کے ترجمہ قرآن کی اہمیت واضح تھی۔ اور ہم اُس سے بے نیاز نہ ہو سکتے تھے۔“

(برہان القرآن۔ ص 102 تا 103)

علامہ طارق ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

”محمد علی (1951م) جن سے ہم نے کہیں بھی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا اور بلا خوف لومہ لامِ ان کی علمی تحقیقات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ کیونکہ ہم نے اس اصول پر کاربند رہنے کا عہد کر لیا تھا کہ وَلَا يَجُرْ مَنْكُمْ شَنَاعٌ قَوْمٌ عَلَى الَّتَّعْدِيلِ لُوْا إِغْدِيلُوا (ماندہ: ۹)۔ لہذا ہم انصاف کو خوبیش و بیگانے کے گھنیاجذبات سے نہیں تو لتے۔۔۔ محترم کی فکر رسا سے انکار نہیں۔ اس ضمن میں ان کے دلائل کی اہمیت بھی روز روشن کی طرح واضح ہے۔“

(برہان القرآن۔ ص 214)

ایک اور مثال

آگے بڑھنے سے پہلے ہم نظریاتی عصیت اور فرقہ وارانہ تنگ نظری کی ایک اور مثال ہدیہ قارین کرنا چاہیں گے۔ یہ مثال ہمیں محترم غلام احمد پرویز کے ”مطلوب الفرقان“ جلد 4 کے صفحہ 149 سے دستیاب ہوئی۔ ملاحظہ فرمائیں:-

”مولانا عبدالمadjد دریابادی (مرحوم) نے قرآن کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ اور تفسیر شائع کی۔ تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دہلی کے ماہنامہ ”برہان“ نے اپنی می 1958ء کی اشاعت کے افتتاحیہ میں (”سنی ترجمہ قرآن“) عنوان کے تحت لکھا۔

”انگریزی زبان میں قرآن مجید کے متعدد تراجم پہلے سے موجود ہیں اور جہاں تک زبان کا معاملہ ہے ایک سے ایک اچھے ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک ایسے ترجمہ کی ضرورت تھی جس کو اہل سنت والجماعت کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اور جس میں قرآنی حقائق و معارف پر صحت عقیدہ و خیال کے ساتھ اسلامی روایات اور جدید معلومات دونوں کی روشنی میں کلام کیا گیا ہو۔ بحمد اللہ اس تفسیر سے یہ ضرورت بڑی خوبی سے پوری ہو جاتی ہے۔“ (بحوالہ طبع اسلام، بابت جولائی 1958)

آپ سوچئے کہ اپنے عقائد اور نظریات کے تابع قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر ”اگر کھلا

ہوا شرک، ”نہیں تو اور کیا ہے؟“ (مطالب الفرقان۔ ج 4۔ صفحہ ۱۳۹)

انتاسب کرنے کے باوجود ندوہ کے سربراہ مولانا ابو الحسن علی ندوی کو اس بات کا افسوس ہی رہا کہ اس تفسیر کو وہ قبولیت نہل پائی جو بقول ان کے اس کا حق تھا۔ یاد رہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے انگریزی ترجمہ کا پیش لفظ مولانا علی میاں ندوی ہی نے لکھا ہے۔ قارئین کرام کو یہ جان کر ضرور جیرانی ہو گی کہ کتابیات والے حصے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا محمد علی جوہر کا نام بطور خصوصی درج تو کیا ہے لیکن اُس محسن کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جس نے انہیں مخدے مسلم اور مسلم سے مفسر بنایا تھا۔

ایک اشد ترین معاند وخالف کا اعتراف حق

”لاہوری جماعت --- نے اشاعت اسلام کاٹھوس کام قادیانیوں کی نسبت کہیں زیادہ کیا ہے۔۔۔ مولوی محمد علی صاحب نے قرآن کرم کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اور اردو میں تین جلدیوں پر مشتمل ایک تفسیر بھی لکھی ہے۔ انگریزی ترجمہ اُس زمانہ کے لحاظ سے بہت اہم تھا۔ کیوں کہ غالباً اُس وقت تک ایک غیر مسلم مصنف کے سو اکسی نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ نہ کیا تھا۔ اور مولوی صاحب کا یہ اجتہاد بھی قابل ستائش ہے۔ کہ انہوں نے قرآن کے انگریزی ترجمے کا ایک ایڈیشن بغیر عربی متن کے شائع کیا۔ جو ہمارے نزدیک قرآن کو دیگر زبانوں میں منتقل کرنے اور اس کی اشاعت کو بڑھانے کے لئے ضروری ہے۔ ان کتب کے علاوہ مولوی صاحب نے صحیح بخاری کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ دو جلدیوں کی اس کتاب میں ترجمہ کے علاوہ مفید حوالی بھی درج ہیں۔ مولوی صاحب کے تفسیری نوٹوں میں اکثر مقامات کا طرز استدلال بہت لوگوں کے لئے قابل قبول نہ ہو گا۔ لیکن یہ بات ہر کوئی مانے گا کہ یہ کتابیں نہایت محنت سے اور مکمل تحقیق کے بعد لکھی گئی ہیں اور اسلامی لٹریچر میں ایک مفید اور خیال آفرین اضافہ ہیں۔“

(احمد یخیریک - محمد جعفر خاں - سندھ ساگر اکادمی - لاہور - ص ۳۱۳)

حضرت علامہ مولانا محمد علیؒ کی انگریزی تفسیر قرآن اور اردو ”بیان القرآن“ (بھیثیت دوپیش رو تفسیریں)

علامہ یوسف علیؒ

ان کی انگریزی تفسیر کا تفصیلی ذکر اور پرگزرنچہ ہے۔ جہاں ہم دکھا چکے ہیں کہ علامہ یوسف علیؒ نے کس حد تک حضرت مولانا محمد علیؒ سے براہ راست استفادہ اور انکی مایہ افتخار انگریزی تفسیر کا اتباع کیا تھا۔ یہاں علامہ یوسف علیؒ کے انگریزی ترجمہ قرآن کے دیباچے کے ایک خضراقتbas پر اکتفا کی جاتی ہے۔ علامہ موصوف حضرت مولانا محمد علیؒ کی شاہکار انگریزی تفسیر کے متعلق لکھتے ہیں۔

”احمدیوں کی لاہور انجمن نے قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے (پہلا ایڈیشن 1917ء)۔ مولوی محمد علی صاحب کے اس ترجمے کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ یہ ایک نہایت ہی عالمانہ تصنیف ہے، جس میں مناسب تشریحی حواشی خاصی مقدار میں ہیں۔ اخیر پر ایک مکمل اشاریہ بھی شامل ہے۔“

(دیباچہ۔ ص XV۔ جلد اول)

الحج حافظ غلام سرورؒ

ان کا رواں تفسیری ترجمہ 1929ء کے قریب لندن سے شائع ہوا۔ اس انگریزی ترجمۃ القرآن میں فٹ نوٹ نہیں۔ تشریحی عبارتوں کو ترجمہ کے درمیان بریکٹوں میں رکھا گیا ہے۔ بقول علامہ یوسف علیؒ اس ترجمہ کو وہ مقام حاصل نہ ہو پایا جس کا یہ حقدار تھا۔ حافظ سرور صاحب نے

حضرت مولانا محمد علی کی انگریزی تفسیر قرآن کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُس کو ہم پچھے درج کرائے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

جناب محمد مارماڈیوک پکتھال

ان کا ترجمہ 1931ء میں معرض شہود میں آیا۔ مسٹر پکتھال نے 1919ء میں احمدیوں کے شہرہ آفاق ووکنگ مسلم شن لندن میں اسلام قبول کیا تھا۔ کچھ عرصہ وہاں بطور امام بھی کام کیا۔ ‘معلومات قرآن’ کا مصنف لکھتا ہے:-

”پکتھال اپنی زبان کا ادیب اور اہل فلم تھا۔ اس کی زبان کی خوبی و شستگی کا کیا کہنا۔ اصلی قرآن کی جاذبیت زبان و بیان ایک حد تک ترجمے میں منتقل ہو آئی ہے۔ البتہ اس میں حاشیتے برائے نام ہی ہیں۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اس ترجمے کو پڑھ کر اطمینان کی سانس لی۔ اور کہا کہ اب جا کر ہم اس قابل ہوئے کہ اپنی کتاب دوسروں کے ہاتھ دے سکیں۔“ (معلومات قرآن ص 187)

تگ نظر علماء کی ناراضگی کے پیش نظر مولانا محمد مارماڈیوک پکتھال نے اپنے ترجمہ میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ انہوں نے اس ترجمہ کی تیاری میں مولانا محمد علی کے ترجمۃ القرآن سے استفادہ کیا ہے، سوائے ایک حاشیہ کے جس میں ضمناً مولانا محمد علی کا نام آگیا ہے۔ لیکن جب مشہور مستشرق اور عربی زبان کے ماہر پادری زویرنے مارماڈیوک پکتھال کے ترجمہ کا مولانا محمد علی کے ترجمۃ القرآن سے موازنہ کیا تو اپنے رسالہ ”مسلم ورلد“ میں یہ رائے ظاہر کی :-

”جب ہم نے مولانا محمد علی، مسٹر مارماڈیوک پکتھال اور حافظ غلام سرور صاحب کے تراجم کا باہم مقابلہ کیا۔ تو دیکھا کہ مؤخر الذکر دونوں اصحاب نے اکثر ویشور مولانا محمد علی کے ترجمۃ القرآن کا ہی اتباع کیا ہے۔ کہیں کہیں تو فرق بس معمولی الفاظ تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان دونوں صاحبوں نے مولانا محمد علی کا اس کثرت سے استفادہ کیا ہے کہ ان تراجم کو اور بیجنل ورک (Original work)

نہیں کہہ سکتے۔ اس استفادہ کی وجہ یہ تھی کہ مولانا کا ترجمہ ایک نہایت وسیع مطالعے اور دقیق ریسرچ پر بنی تھا،” (مسلم ولد، بابت جولائی 1931ء)

مولانا مرزا ابوالفضل

قرآن کریم کے انگریزی تراجم کی تاریخ میں ایک ناقابل سُنگ میل، مولانا مرزا ابوالفضل کا انگریزی ترجمۃ القرآن پہلی بار 1914ء میں شائع ہوا۔ مرزا صاحب موصوف نے اس ترجمہ میں قرآن پاک کی موجودت تیب کو چھوڑ کر امام سیوطی اور جرم من مستشرق نولڈ کی (Noldeke) کی بتائی ہوئی مفروضہ نزولی ترتیب اپنائی تھی۔ پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں مترجم صاحب نے یہ بھی لکھا ہے:-

”آخر پر میں یہ بتادینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا پورا احساس ہے۔ کئی نقصان ایسے ہیں جن کو میں اگلے ایڈیشن میں دور کر دینا چاہوں گا۔ تب تک اس ترجمہ کو ایسے ہی پیش کیا جا رہا ہے۔ موجودہ صورت میں بھی یہ کچھ قاریوں کے لئے حکمت الہیہ سمجھنے میں مددگار ثابت ہو گا۔“

وفات سے پہلے جناب مرزا ابوالفضل نے 1955ء میں قرآن کریم کا ایک نیا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ اس بار سورتوں کی نزولی ترتیب کو چھوڑ کر مردوجہ متداول ترتیب ہی کو اختیار کیا ہے۔ دیباچہ میں مرزا ابوالفضل لکھتے ہیں:-

”میرے سابقہ 1916ء کے ایڈیشن کے بعد قرآن پاک کے کچھ شاندار انگریزی تراجم معرض وجود میں آچکے ہیں۔ ایک تو مولانا محمد علی، ہی کا ہے اور دوسرا مسٹر عبداللہ یوسف علی کا۔ عالم فاضل ہونے کے باوجود مسٹر عبداللہ یوسف علی نے متقدمین کی تفسیری آراء ہی کا اتباع کیا ہے۔ اس کے برکس مولانا محمد علی جامد تقلید اور انہی پیروی کے معاملے میں خاصے آزاد خیال ہیں۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے موجودہ ترجمۃ القرآن کی تیاری میں ان دونوں اصحاب سے کافی استفادہ کیا ہے۔ جس کے لئے میں ان کا مرہون منت ہوں۔ کہیں کہیں میں نے ان سے

اختلاف رائے بھی کیا ہے۔” (ابوالفضل، کیم جنوری 1955ء)

مرزا صاحب کے اس ترجمہ میں قرآنی متن شامل نہیں۔ سارے ترجمہ میں آجائے ایک ہی فٹ نوٹ ہے۔ بدقتی سے وہ بھی اپنی صحیح جگہ چھپ نہ سکا۔ اس کو & Corrigendum کے طور ترجمہ کے بالکل آغاز میں رکھ دیا گیا ہے۔ یہ عالی خیال تحقیقی نوٹ اس Addendum قابل ہے کہ ہم اسے اپنے معزز قارئین کی خدمت میں پیش کریں:-

ترجمہ: ”برائے کرم (سورت نمبر 23 کی) آیت 50 کو یوں پڑھا جائے:

”ہم نے مریم کے بیٹے اور اس کی ماں کو ایک نشان بنایا۔ اور انہیں ایک ایسی بلند سر زمین پر پناہ دی جہاں میوہ کی افراط ہے اور نہریں جاری ہیں۔“

(یہ ترجمہ ہم نے مرزا صاحب کی لغت ”غیرہ القرآن“ سے لیا گیا ہے۔ خورشید) حاشیہ۔ ”ایسا لگتا ہے کہ صلیب دیتے جانے اور دوبارہ جی اٹھنے کے نام نہاد واقعہ کے بعد حضرت عیسیٰ مالی کے بھیں میں چھپ کروقت گزارنے لگے۔ چالیسویں دن وہ اپنے ظالم وطن والوف سے والدہ ماجدہ کے ساتھ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اس سر زمین میں پناہ گزیں ہوئے جس کا ذکر متذکرہ بالا آیت میں ہے۔ جہاں انہوں نے حدیث بنوی کے مطابق ایک لمبی یعنی 125 سال کی عمر پائی۔ (جو قاری حضرت عیسیٰ کے ہندوستان کی طرف سفر سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اُسے چاہئے کہ وہ روئی سیاح ایم ناتوفوچ (M.Notovitz) کا سیاحت نامہ پڑھے، جس میں وہ ہمیں (لداخ) کے بده گھمپا میں ایسے تاریخی شواہد کی موجودگی کا ذکر کرتا ہے۔ جس کا تعلق زیر بحث موضوع سے ہے۔“

”غیرہ القرآن“ میں رَبُّوَة لفظ کے تحت یہ عبارت آئی ہے:-

”ایسی بلند سر زمین میں جہاں میوہ کی افراط ہے اور نہریں جاری ہیں۔ یہ بیان ہے اس سر زمین کا جہاں صلیبی کا رروائی کے بعد حضرت مسیح اور ان کی والدہ ماجدہ کو پناہ ملی۔ مولوی محمد علی اپنے ترجمہ قرآن مجید میں یہ مقام کشمیر کو فرار دیتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ آنحضرت کے تاریخی حالات بھی اسی کے معاون ہیں۔“

(غیرہ القرآن۔ از مرزا ابوالفضل بن فیاض علی)

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (وفات - 1958)

ان کی مشہور تفسیر "ترجمان القرآن" (1931ء) کے بارے میں مؤرخ اسلام علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اکرم صاحب (ڈی، لٹ) کا یہ تاریخی ریمارک قبل دید ہے:-

"گذشتہ ربع صدی میں انگریزی خوان طبقے کو قرآن سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب مولانا محمد علی کا "ترجمۃ القرآن" ہے۔ آج مولانا ابوالکلام آزاد نے مطالب قرآنی کو واضح کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کا نمونہ مولوی محمد علی نے اب سے پہلے پیش کر دیا تھا۔"

(موج کوثر ص 105۔ طبع اول)

مولوی اور تنگ نظر علماء کی مخالفت اور برہمی کے خوف سے مولانا آزاد والا جملہ مابعد کے ایڈیشنوں سے نکال دیا گیا ہے۔ لیکن آنکھیں بند کر لینے سے سورج کا اجالا ختم نہیں ہو جاتا۔ متقید میں کی تفاسیر میں دو بڑے نقص تھے، جن کو خود ہمارے رائخ العقیدہ علماء بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ایک اسرائیلیات یعنی غیر معتبر، غیر اسلامی تفسیری روایات کی بھرمار۔ دوسرے روزہ مرہ کے سید ہے سادے واقعات کو بلا وجہ خرق عادت اور مججزہ بنانا اور پھر اپنی بات کو قائم رکھنے کے لئے بے سروپا، بعد از عقل و قیاس، قصے اور کہانیوں کا سہارا لینا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اپنی اس نامناسب اور غیر واجب رائے کو حتمی اور قطعی قرار دے کر قرآن جیسی روشن اور پر حکمت کتاب کو ہیٹا ٹھہرانا۔ مولانا محمد علی نے اپنی مایہ ناز تفسیر "بیان القرآن" کو ان دونوں نقاض سے پاک رکھا۔ با اس ہمہ مولانا محمد علی نے کبھی بھی کسی ایسی خرق عادت بات یا مججزہ کا انکار نہیں کیا جو قرآن کے صریح ارشادات اور نبی آخر محمد مصطفیٰ واصح محتبی ﷺ (فراد امی وابی) کے واضح فرمودات سے ثابت ہو۔ جن امور میں مفسرین عظام کے یہاں پہلے ہی سے اختلاف ہو، وہاں کسی خاص رائے کو فوқیت دینا یا کسی جدید رائے کو پیش کرنا گناہ نہیں۔ نہ اس کو مل اعتراف بنایا جا سکتا ہے۔ اسی نجح کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے "ترجمان القرآن" میں اپنایا ہے۔ کچھ مثالیں حاضر ہیں:-

ذوالقرنین کی تاریخی تحقیق

”ذوالقرنین کی تعین اور تشخص میں پندرہ سو سس کا تمام تفسیری لٹریچر مختلف احتمالات اور اندازے پیش کرنے پر اکتفا کرتا رہا ہے۔ اور اگر کسی قول کو ترجیح دی گئی تو وہ علامہ ابن کثیر ذمشقی (وفات 774ھ/1372ء) کی تحقیق ہے۔ جس میں ذوالقرنین وہ سکندر رہ جسے حضرت ابراہیمؑ کی معاصرت حاصل ہے۔ حضرت محمدث کشمیرؒ نے بھی شارح بخاری علامہ عینی کے حوالہ سے اسی رائے کو تسلیم کیا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس تحقیق سے گریز کیا ہے۔ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے 1925ء میں علامہ ابن کثیرؒ کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ اور یاجوج ماجوج کے بارے میں یہ عجیب بات لکھی ہے۔ ”میرا خیال ہے یاجوج ماجوج کی قوم انسانوں اور جنات کے درمیان ایک بزرگ خلوق ہے۔“ (حمائل ص 393)

مولانا محمد علی لاہوری نے اپنی تفسیر ”بیان القرآن“ (1922) میں تمام قدیم توجیہات سے ہٹ کر دنیا آنی کے خواب پر توجہ کی اور بابل کے اشارہ سے فارس کے شہنشاہ دارائے اول کو قرآن کا ذوالقرنین بتایا۔ دارائے اول سائرس کا دادا تھا۔ اور یاجوج ماجوج عیسائی قوموں کو قرار دیا۔ (جلد دوم ص 1191)۔ قدیم تحقیقات سے ہٹ کر فارسی حکمران دارائے اول کی طرف یہ پہلا تحقیقی اشارہ تھا۔ اس اشارہ کو مکمل تحقیق اور نشاندہی تک پہنچانے کا سہرا مولانا آزاد کے سر ہے۔“

(مولانا آزاد کی قرانی بصیرت ص 208۔ مؤلف مولانا اخلاق حسین قاسمی)

حضرت ابراہیمؑ اور پرندے

قرآن کریم فرماتا ہے:-

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرْنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىْ طَقَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ طَقَالَ يَلَىْ
وَلِكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ طَقَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ

اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِنْهُنَّ جُزْءاً اُثْمَ اذْعُهُنَّ يَا تَيْنَكَ سَعِيَا طَ وَاعْلَمْ اَنَّ
اللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ (البقرہ-آیت 260)

”اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ کہا! کیا تو نے نہیں مانا؟ کہا: باں! مگر اس لئے کہ میرے دل کو اطمینان حاصل ہو۔ کہا تو چار پرندے لے۔ پھر انہیں اپنے ساتھ ہلا لے۔ پھر ان میں سے ایک ایک حصہ ہر ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو بلاو، تیرے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے اور جان لے اللہ غالب حکمت والا ہے۔“ (ترجمہ محمد علیؒ)

مثال بالکل صاف اور واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو کہا کہ چار پرندے لو، ان کو اپنے ساتھ ہلا لو، پھر ان کو ایک ایک کر کے چار مختلف سمتوں میں رکھ دو۔ پھر بلاو۔ تو وہ تمہاری آواز پر بھاگے چلے آئیں گے۔ مطلب یہ کہ جب ایک پرندہ جو انسان سے بہت دور رہنے والی چیز ہے، لیکن انسان اسے ہلا لے تو یہاں تک اُسے اپنے حکم کے تابع کر سکتا ہے کہ وہ اس کی آواز پر فوراً اڑا چلا آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو خالق و مالک ہے، اس کا تصرف مخلوق پر کیوں اس سے بڑھ کرنا ہو۔ قدامت پرست مفسرین نے اس سیدھی سادی آیت کو کچھ کا کچھ بنادیا:-

”اور جب ابراہیم نے (خدا سے) کہا۔ پروردگار! مجھے دکھا کرو مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا۔ خدا نے فرمایا کیا تم نے (اس بات کو) باور نہیں کیا؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں؟ لیکن (میں دیکھنا) اس لئے (چاہتا ہوں) کہ میرا دل اطمینان کامل حاصل کر لے۔ خدا نے فرمایا کہ چار جانور پکڑوا کر اپنے پاس منگالو (اور ٹکڑے ٹکڑے کرادو) پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر ایک پہاڑ پر رکھا دو۔ پھر ان کو بلاو۔ تو وہ تمہارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے۔ اور جان رکھو کہ خدا غالب اور صاحب حکمت ہے۔“ (ترجمہ ازمولانا تھانویؒ)

”اور جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے پروردگار! مجھے دکھا کرو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ (جناب باری تعالیٰ نے) فرمایا، کیا تمہیں ایمان نہیں؟ جواب دیا ایمان تو ہے لیکن میرے دل کی تسلیم ہو جائے گی۔ فرمایا

چار پرندو، ان کے ٹکڑے کر ڈالو، پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو پھر انہیں پکارو، تمہارے پاس دوڑے ہوئے آ جائیں گے اور جان رکھو! اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمتوں والا ہے۔“

(ترجمہ مولانا جونا گڑھی۔ یہ ترجمہ مکہ سے شائع ہوا ہے)

”جب ابراہیم[ؐ] نے کہا کہ اے میرے رب تو کیونکر مُردے کو جلاتا ہے۔ فرمایا کیا تو ایمان نہیں لایا؟ اُس نے کہا، ایمان تو لایا ہوں لیکن اپنے دل کا اطمینان چاہتا ہوں۔ فرمایا، چار پرندے لے اور ان کو اپنے ساتھ ہلا لے پھر ہر پہاڑ پر ان کے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا ڈال دے۔ پھر ان کو پکار۔ وہ تیرے پاس دوڑتے آئیں گے۔ اور جان لے کر اللہ بزرگ دست حکمت والا ہے۔“

(ترجمہ۔ محمد عفیف ندوی)

آیت کریمہ میں قیمہ بنانے یا ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا قطعاً کوئی ذکر نہیں۔ صر کے بعد جب الٰی آئے تو معنی صرف اور صرف مائل کرنے یا زیادہ سے زیادہ سدھا کر ہلاملائیں کے ہوں گے۔ یہ بات مولانا محمد علی کہیں تو مرزا یت، مولانا آزاد کہیں تو قرآن شریف کی صحیح ترجمانی؟ مولانا آزاد کا ترجمہ ملا حظہ ہو:

”اور پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم نے کہا تھا۔ اے پروردگار! مجھے دکھا دے، کس طرح تو مُردوں کو زندہ کر دے گا؟ اللہ نے فرمایا، کیا تمہیں اس کا یقین نہیں؟ عرض کیا ضرور ہے لیکن یہ اس لئے چاہتا ہوں تاکہ میرے دل کو قرار آجائے (یعنی تیری قدرت پر تو یقین و ایمان ہے، لیکن یہ جو مایوس کن حالت دیکھ کر دل دھڑ کنے لگتا ہے تو وہ بات دور ہو جائے) اس پر ارشادِ الٰہی ہوا، اچھا یوں کرو کہ پرندوں میں سے چار جانور پکڑلو، اور انہیں اپنے پاس رکھ کر اپنے ساتھ ہلا لو (یعنی اس طرح ان کی تربیت کرو کہ وہ اچھی طرح سے ہل جائیں) پھر ان چاروں میں سے ہر ایک کو (اپنے سے دُور) ایک ایک پہاڑ پر بٹھا دو۔ پھر انہیں بلا وہ (آواز سنئے ہی) تمہاری طرف اُڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ یاد رکھو! اللہ سب پر غالب

اور اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔“

(ترجمان القرآن، جلد 1 ص، 327 تا 328، مکتبہ سعید، کراچی)

اب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

”اور وہ واقعہ بھی پیش نظر ہے، جب ابراہیم نے کہا تھا کہ ”میرے مالک! مجھے دکھادے، تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟“ فرمایا: کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ اس نے عرض کیا، ایمان تو رکھتا ہوں، مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔ فرمایا: اچھا، تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے منوس کر لے۔ پھر ان کا ایک ایک جزو ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکارو وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت با اقتدار اور حکیم ہے۔“

(تفہیم القرآن۔ جلد اول ص ۲۰۱ و ۲۰۲)

اصحاب کہف کون تھے؟

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ کچھ نوجوان تھے، جو حضرت عیسیٰ کے مذہب پر تھے۔ اُس دور کے بادشاہ ڈیسنس یا دیانوس کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر ایک غار میں پناہ گزیں ہوئے۔ اطلاع ملنے پر بادشاہ نے غار کے سامنے دیوار بنوادی اور دوسو سال سے لیکر کوئی چار سو سال تک اسی غار میں سوئے رہے۔ پھر جب جا گئے تو اس وقت رومان امپائر میں عیسائی مذہب کا دور دورہ تھا۔ اس لئے ان کی اطلاع ملنے پر اس وقت کا بادشاہ خود انہیں دیکھنے کیا اور بعض روایات میں ہے کہ اس نے انہیں دیکھا اور بعض کے مطابق ان کا پتہ نہ ملا۔ یہ لوگ سال میں ایک بار یا چھ ماہ میں ایک کروٹ لیتے تھے۔ ان کی آنکھیں نیند میں بھی کھلی رہتی تھیں۔ ان کی ساتھ کتنا بھی تھا، جو اس عرصہ چوکھٹ پر پیر پسارے پہرہ دیتا رہا۔ سو یا نہیں، اُسے غذا اپنے ہاتھ چاٹنے سے پہنچ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی بہت ساری باتیں اور زوائد اس قصے کے ساتھ جوڑ دیتے گئے ہیں۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ کہف کی ابتدائی دس اور آخری دس آیتوں کو دجال سے متعلق بتایا ہے۔ اور چونکہ دجال کا فتنہ اصل میں عیسائی اقوام ہی کا فتنہ ہے، لہذا اس سورت کو

اسی تناظر میں لینا ہوگا۔ جن لوگوں نے ایسا نہیں کیا انہیں قدم قدم پر مشکلات اور حیرانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس گتھی کو سب سے پہلے حضرت مولانا محمد علی ہی نے سلبھایا۔ یہ بات اور ہے کہ قدامت پرست علماء اس پر بھی ناراض ہو گئے۔

حضرت مولانا محمد علی نے دلائل اور تاریخی شواہد کی لمبی بحث سے یہ ثابت کیا کہ اس سورت میں دراصل عیسائیت کی تاریخ کا بیان ہے۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں:

”قرآن شریف نے صرف اصحاب الکھف کا نام اختیار کرنے کے بعد نے اصحاب الکھف والرقیم فرمایا ہے۔ کیونکہ عیسائیت کی تاریخ کا خلاصہ انہی دو الفاظ میں آجاتا ہے۔ یعنی کھف (غار) اور رقم (تختی) میں۔ عیسائیت کی ابتدائی تاریخ غار سے وابستہ ہے۔ اور اس کی آخری رقم سے۔ عیسائیت کی پروش غاروں میں ہوئی نہ صرف اس لئے کہ ابتداء میں اس مذہب کے قبول کرنے والوں کو مظالم سے شک آکر غاروں میں پناہ لینی پڑی، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ عیسائیت کا پہلا رحمان رہبانیت کی طرف تھا۔ اور اس لئے عیسائیوں میں جو بڑے بڑے لوگ ہوئے انہوں نے رہبانیت اختیار کر کے غاروں میں ہی اپنے کمال کو حاصل کیا۔ اور دنیا کو بکلی ترک کر کے گوشہ گزینی اختیار کی جس کی طرف لفظ کھف میں اشارہ ہے۔ اور اس مذہب کی آخری حالت ”رقم“ سے وابستہ ہے۔ یعنی لکھی ہوئی تختیوں سے۔ جو اس قوم کا نمایاں امتیاز ہے کہ نہ صرف ہرزندہ شخص کے نام کی تختی لکھی ہوتی ہے۔ نہ صرف مردہ کی تبر پر لکھی ہوئی تختی ہوتی ہے۔ بلکہ ان کی تمام تجارتی اشیاء پر بھی ایک لکھی ہوئی تختی ہوتی ہے۔ اور لفظ رقم کے اختیار کرنے میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ ”رقم“ کے معنی کپڑوں پر قیتوں کا لکھنا بھی ہیں۔ اور تجارتی اشیاء پر قیتوں کے لکھنے میں اشارہ و سمعت تجارت کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ یا ان کے تجارت اور دنیا میں انہا ک کی طرف.....“ (بيان القرآن، جلد 2، فتح نوٹ 1897)

اب ذرا مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف آئیں۔ مولانا موصوف اپنے ”ترجمان القرآن“

میں لکھتے ہیں:-

”دراصل یہ سارا معاملہ ہی دوسرا ہے اور جب تک مفسرین کے پیدا کئے ہوئے تخلیل سے بالکل الگ ہو کر تحقیق نہ کی جائے اصلیت کا سراغ نہیں مل سکتا۔“

(ترجمان القرآن - جلد 2 - ص 396)

جب یہی بات پچیس برس قبل مولانا محمد علی نے کہی تو اس کو قرآن شریف میں تحریف اور مفسرین کرام سے سرتائی کیا گیا۔ اب مولانا آزاد کی تحقیق کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں:-

”پھر یہ بات سامنے لانی چاہئے کہ یہ واقعہ مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا ہے۔ اور جنہیں پیش آیا وہ عیسائی تھے۔ صرف اتنی بات پر غور کرنے سے سارا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔ مسیحی دعوت کے ابتدائی قرنوں ہی میں زہد و انزوا کی ایک خاص زندگی شروع ہو گئی تھی۔ جس نے آگے چل کر رہنمائی (مناسک ازم) کی مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ اس زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ لوگ ترک علاقے کے بعد کسی پہاڑ کی غار میں یا کسی غیر آباد گوشہ میں مختلف ہو جاتے تھے۔“ (ایضاً)

لیکن الرقیم اور کتے والے حصے کی توضیح و تشریح سے احتراز فرمایا ہے۔

حضرت ابراہیم اور تین جھوٹ

ویسے تو حضرت ابراہیم جھوٹ بولنے کے عادی نہ تھے۔ لیکن بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق تین جھوٹ انہیں بھی بولنا ہی پڑے۔ جن میں دوجھوٹ اللہ کے لئے تھے اور ایک اپنی ذات کیلئے۔ ایک جھوٹ تو یہ تھا کہ مندر کے بتوں کو خود توڑاً مگر دریافت کرنے پر کہہ دیا کہ یہ کام وارے والے بت نے کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ جب لوگوں نے کسی قومی تقریب میں شمولیت کے لئے کہا تو تقدیرست ہو کر بھی کہہ دیا کہ میں بیار ہوں اس لئے نہیں چل سکتا۔

(بخاری حدیث نمبر 3358, 3351 خلاصہ)

اس حدیث میں راوی تیسرے جھوٹ کا ذکر نہیں کرتا۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام، بلا کسی

انتشاء کے، معصوم عن الخطأ ہیں۔ انبیاء کی پاکیزگی اور معصومیت قرآن کریم کی نص صریح سے ثابت ہے۔ عقیدہ مسلمان بھی اسی بات کے قائل ہیں۔ لیکن بدستقی سے ہمارے اسلاف نے اپنی تفاسیر میں ایسی روایات کو جگہ دے دی ہے جو عقیدہ عصمت انبیاء کے سراسر مخالف ہیں۔ ستم بالائے ستم، ان میں سے بعض باتیں احادیث میں بھی راہ پائی ہیں۔ ان غیر اسلامی اور غیر قرآنی نظریات کے خلاف آواز بلند کی جائے تو ہر دور میں ایک ہی جواب ملتا رہا ہے:-

”کیا ہم اُن عالی مرتبہ کا بر مفسروں نیز عادل و ثقہ راویوں کو جھوٹا کہیں جنہوں

نے یہ خبر فراہم کی ہے؟“

اصول تفسیر پر بحث

حضرت مولا ن محمد علیؑ نے ”بیان القرآن“ کی تمہید ہی میں اصول تفسیر پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:-

”میں نے جن اصول کو مدنظر رکھا ہے وہ یہ ہیں۔ اول یہ کہ قرآن کریم کے ایک موقعہ کا حل دوسرے موقعہ سے کیا جائے اور یہ اصول خود اس پاک کتاب نے بتایا ہے۔ جہاں متشابہات کے ذکر میں کل من عندر بنا فرمایا کہ ایک مقام کی تفسیر قرآن کریم کے دوسرے مقام کے خلاف نہیں ہونی چاہئے۔ جہاں تک میں نے اس پاک کتاب پر غور کیا ہے یہی معلوم ہوا ہے کہ کوئی مضمون اس میں ایک جگہ بطور اشارہ یا برگنج احوال ہے تو دوسری جگہ اس کی وضاحت اور اس کی تفصیل موجود ہے۔ اور اس بات نے مجھے بہت سے مشکل مقامات کے حل کرنے میں مدد دی ہے۔ اور جہاں معنی میں اشتباہ واقع ہو وہاں سب سے بڑھ کر خود قرآن پاک اس اشتباہ کو دور کرتا ہے۔ دوسری بات یہ مدنظر رکھی ہے کہ احادیث صحیحہ کو تفسیر میں اور باتوں پر مقدم کیا جائے۔ اس غرض کے لئے میں نے امام بخاری کی کتاب الشیخ، تفسیر ابن حجر یا اور تفسیر ابن کثیر کو سامنے رکھا ہے۔ لیکن یہاں چند باتوں میں اختیاط ضروری ہے۔ یعنی اول کوئی حدیث خواہ وہ صحاح ستہ سے ہو قابل قبول نہیں اگر قرآن کی صراحت کے خلاف ہو یا اصول دینی کے خلاف ہو۔ دوم تفاسیر میں بہت سی اسرا یلی روایات راہ پائی ہیں۔ اور ان پر اس قدر اصرار ہو گیا ہے کہ ان کے خلاف اگر کہا جائے تو بعض لوگ ناواقفی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ حدیث کو رد کر دیا گیا۔ سوم فصل کی احادیث پر خود محدثین نے وہ تنقید نہیں کی جو امار و نواہی کی احادیث

پر کی ہے۔ اس لئے حدیث قصص بہت اختیاط سے قبول کرنے کے قابل ہیں۔ چہارم جو باقی احادیث میں واقعات یا مشاہدہ یا مسلمہ تاریخ کے خلاف ہوں وہ قابل قبول نہیں۔ اور ان سب امور کے علاوہ یہ بات مدنظر رکھنے کے قابل ہے کہ احادیث بالخصوص احادیث قصص میں روایت بالمعنى ہے۔ تیسری بات جس کا میں بالخصوص ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ میں نے (ترجمہ میں) استعمال الفاظ کے متعلق لغت کو سب سے مقدم کیا ہے۔ جن معنوں کی اجازت لغات عربی نہیں دیتی ان معنوں کو قبول نہیں کیا۔ صحابہ کے اقوال کی میں بہت عزت کرتا ہوں، لیکن کسی صحابی سے اختلاف کرنا جرم نہیں۔ صحابہ میں خود آپس میں اختلاف تھے۔ مفسرین نے بھی ان سے اختلاف کیا ہے اور سب سے آخر اقوال مفسرین کے متعلق اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ان بزرگوں کی محنت کی، ان کے علم و فضل کی، ان کے عشق قرآن کی میرے دل میں بے حد عظمت ہے۔ اور ان کی خدمت قرآن کے سامنے میں اپنی اس ناچیز خدمت کو یقین سمجھتا ہوں۔ لیکن حالات زمانہ کے اثر سے کوئی شخص خالی نہیں ہو سکتا۔ آج اس زمانہ میں نئے علوم نے قرآن کریم کی عظمت کو اور بھی بڑھادیا ہے۔ میرے خیالات حالات زمانہ سے متاثر ہو کر غلط ہو سکتے ہیں۔ مگر خدا کے کلام کے ایک حرف کو بھی کوئی علم باطل نہیں کر سکتا۔ ہاں اپنے زمانہ کے مطابق جو علوم ہوں ان کی روشنی میں ہی ہم جو بکچھ خدمت کر سکتے ہیں کرتے ہیں۔

(بيان القرآن، تہذیب، ص ب)

جھوٹ نمبر ۱ پر مولانا محمد علی کا تبصرہ

قَالُوا إِنَّكَ فَعَلْتَ هَذَا بِالْهِيَّاتِ يَا بَرِّهِيمُ . قَالَ بَلْ فَعَلَّةٌ كَبِيرُهُمْ
هَذَا فَسْئَلُوهُمْ إِنْ كَانُوا يُنْطِقُونَ .

”کہا: اے ابراہیم! کیا تو نے ہمارے معبدوں سے یہ کام کیا ہے؟ اس نے کہا: بلکہ یہ کیا (جس نے کیا)۔ ان کا بڑا یہ ہے، سوان سے پوچھوا گروہ بولتے ہیں۔“
(الأنبياء ۲۱۔ آیت ۶۲-۶۳)

تشریح : یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ بَلْ فَعَلَّةٌ پر وقف ہے اور اسی کو مد نظر نہ رکھنے

سے حضرت ابراہیم کی طرف یہ جھوٹ منسوب کرنا پڑتا ہے۔ کہ آپ نے خود بت توڑنے سے انکار کیا۔ اور جواب یہ دیا کہ بڑے بٹ نے چھوٹے بتوں کو توڑ دیا ہے۔ یہ کہنا کہ اس طرح ان پر الزم ادینا مقصود تھا۔ صحیح نہیں اسلئے کہ اس قسم کا الزام تو بغیر جھوٹ کے بھی دیا جا سکتا تھا۔ اور اس معنی کے خلاف اور قرآن بھی ہیں۔ اول حضرت ابراہیم نے علی الاعلان انہیں کہہ دیا تھا لَا إِكْيَدَنَ أَصْنَامُكُمْ بَعْدَ أَنْ تُوَلُوا مُذْبِرِينَ (۷۵)۔ یعنی میں (ضرور) تمہارے بتوں کو تکلیف پہنچاؤں گا، اس کے بعد کہ تم پیٹھ پھیرتے ہوئے واپس چلے جاؤ گے۔ مفسرین نے اس صریح خطاب کو جو قوم سے حضرت ابراہیم نے کیا تھی طور پر کہنا فرار دیا ہے۔ اگر تھی تھا تو بعد آن تُوَلُوا کے کیا معنی ہوئے۔ وہ تو کچھ لوگوں کو خطاب کر کے کہہ رہے ہیں کہ تم پھر جاؤ گے تو میں انہیں نقصان پہنچاؤں گا۔ اور اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کوڈ رایا ہو گا کہ اگر تم بتوں کیخلاف کوئی بات منہ سے نکالو گے تو وہ تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا: انہوں نے مجھے کیا نقصان پہنچانا ہے میں (ہی) انہیں نقصان پہنچاؤں گا۔ اور طرز عبارت صاف بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات میدان مقابلہ میں کہی ہے۔ اور بہت لوگوں نے اسے سنایا ہے۔ اسی لئے جب بہت سے بت ٹوٹے ہوئے پائے گئے اور تحقیقات شروع ہوئی۔ تو بہت سے لوگ بول اٹھے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو یوں کہتے سنا تھا۔ اسی لئے ابراہیمؑ کو بلا یا گیا تاکہ سب کے سامنے یہ گواہی دی جائے۔ یہ دوسرا فرینہ اس بات پر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فعل کا انفہانیں کیا۔ اور انخفا کرنے سے ان کی اصل غرض پوری نہ ہوتی تھی۔ تیسرا اور نہایت قوی قرینہ یہ ہے کہ بڑے بٹ سے پوچھنے کے لئے نہ حضرت ابراہیمؑ کہتے ہیں۔ اور نہ پچاری بڑے بٹ کے متعلق نہ بولنے کا عذر کرتے ہیں۔ بلکہ حضرت ابراہیمؑ بھی کہتے ہیں فَسَأَلُوْهُمْ أَنْ كَانُوا يَنْطِقُونَ (سوال سے پوچھو! اگر وہ بولتے ہیں۔) اور وہ جواب میں کہتے ہیں۔ مَاهُو لَاءٌ يَنْطِقُونَ۔ (آیت 65۔ یعنی یہ بات نہیں کرتے)۔ اگر بڑے بٹ کو اس لئے چھوڑا

گیا تھا کہ قتل کو اس کی طرف منسوب کیا جائے تو فَسْئَلُوهُ (سواس سے پوچھلو) کہنا چاہئے تھا نہ فَسْئَلُوهُمْ (سوان سے پوچھو)۔ اور وہ بھی جواب میں کہتے کہ یہ بولتا نہیں۔ پس وہ صورتِ الزام بھی نہ رہی جو اس جھوٹ کی غرض بتائی جاتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کسی مصلحت اور غرض کے لئے کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ ان کی سب اغراض اور ان کے سب مصالح سچائی سے پورے ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔

(بیان القرآن۔ ص 906۔ فٹ نوٹ 2167)

جھوٹ نمبر 2 اور 3 پر تبصرہ

فَأَظْرَرَ نُطْرَةً فِي النُّجُومِ. فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ.

ترجمہ۔ ”تب اس نے ستاروں کو ایک نظر دیکھا۔ اور کہا میں تو بیمار ہوں۔“ (۸۹:۳۷۸۸)

تشریح: اے مفسرین نے حضرت ابراہیم کے تین جھوٹوں میں سے ایک ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ (اللہ کی گواہی کے ابراہیم صدیقاً نبیاً) (مریم: ۱۹۔ آیت ۴۱) صدقی نبی تھا۔ ان تینوں جھوٹوں کو خود جھوٹا ٹھہراتی ہے۔ اور یہ کہنا کہ یہ جھوٹ اللہ کی راہ میں تھے بے معنی ہے۔ اللہ کی راہ اور بدی۔ یہ دو باقی مجمع نہیں ہو سکتیں۔ بدی نہ اللہ کی طرف منسوب ہو سکتی ہے نہ اللہ کی راہ کی طرف۔ اگر جھوٹ بونا برافعل ہے تو کسی وقت بھی جائز نہیں۔ جس طرح چوری کرنے کی صورت میں بھی جائز نہیں مثلاً اگر ایک بست کے پہنائے ہوئے زیور چرانے جائز نہیں۔ خواہ نیت ان کو اچھی جگہ صرف کرنے کی ہی ہو۔ تو جھوٹ بول کر بست کا نوٹ نا بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ سَقِيمٌ سے مراد سَقِيمُ الْقَلْبِ (دل کی بیماری، دل کی بے زاری) لیکر، جس کی لغت اجازت دیتی ہے۔ کوئی وقت باقی نہیں رہتی۔ اور نہ خواہ نوٹ ایک نبی کی طرف جھوٹ منسوب کرنا پڑتا ہے۔ اور ”نجوم“ کی طرف دیکھ کر، یہ نقرہ بمعنی سَقِيمُ الْقَلْبِ اور بھی زیادہ موزوں ہے۔ اس لئے کہ وہ لوگ نجوم کی عبادت کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں دوسری جگہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ان کی بحث کا ذکر ہے۔ فَلَمَّا... رَا كَوْكَباً قَالَ هَذَا رَبِّي

(الانعام 6 آیت 76۔ سو جب اس نے ستارہ دیکھا۔۔۔ کہا : کیا یہ میر ارب ہے؟) اور اگر بیمار ہی معنی لئے جائیں تو اس کے جھوٹ ہونے پر کیا دلیل ہے؟ ستاروں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات بہت چلی گئی ہے۔ تب انہوں نے کہا میں بیمار بھی ہوں اور زیادہ نہیں جاگ سکتا۔ زبردستی اسے جھوٹ بنانے سے کیا حاصل ہے۔“

(بيان القرآن۔ ص 1156۔ فٹ نوٹ 2791)

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رائے

”عام طور پر مفسروں نے یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ حضرت ابراہیم نے تین موقعوں پر ایسی بات کی جس پر بظاہر جھوٹ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں استدلال صحاح کی ایک روایت سے کہا جاتا ہے۔ تفسیر قرآن کی تاریخ کی بولجھیوں میں اس سے بڑھ کر اور کوئی قابل توجیہ بولجھی نہیں۔ قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے اس اصدق الصادقین کا جھوٹ بولنا نکلتا ہو۔ لیکن بہ تکف ایک آیت کو توڑ مرور کر ایسا بنا لیا جا رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح جھوٹ بولنے کی بات بن جائے اور اثبات کذب کی یہ مبارک کوشش کیوں کی جا رہی ہے؟ صرف اس لئے کہ مزعمہ حدیث موجود ہے۔ لیں کہیں یہ قیامت نہ ٹوٹ پڑے کہ اس کے غیر معموم راویوں کی روایت کمزور مان لئی پڑے۔ گویا اصل اس باب میں غیر معموم راویوں کا تحفظ ہے نہ کہ معموم رسولوں کا۔ اور اگر قرآن میں اور کسی روایت میں اختلاف واقع ہو جائے تو قرآن کو روایت کے مطابق بننا پڑے گا۔ راوی کی شہادت اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہل سکتی۔“ (ترجمان القرآن۔ ص 495 تا 496)

قرآنی آیات کا سیاق و سبق مدنظر کھر کر دو تین صفحوں پر ایک لمبی بحث کے بعد خلاصہ یوں پیش کرتے ہیں:-

”اب غور کرو، اس تمام سرگذشت میں کوئی بات ایسی ہے، جس سے حضرت ابراہیم کا جھوٹ بولنا نکلتا ہو؟ بتوں کو انہوں نے کچھ چوری چھپنے ہیں توڑا تھا کہ خلاف واقعہ بات کہہ کر اسے چھپانا چاہئے۔ تمام پچاریوں کے سامنے صاف صاف اعلان

کر دیا تھا۔ اور اعلان بھی تاکید کے ساتھ کہ ”تالله لا کیدن اصنامکم“ خدا کی قسم! میں ضرور تمہارے ہتوں کو اپنے داؤ کا نشانہ بناؤں گا۔ پھر جوبات اس طرح صاف صاف کہہ دی گئی ہو اور اعلانیہ کی گئی ہو۔ اس میں جھوٹ بولنے کی بات کہاں سے نکل آئی؟ باقی رہا ان کا یہ کہنا کہ ”بل فعلہ کبیرہم هذا“ تو ظاہر ہے کہ ایک لمحہ کے لئے اس سے مقصود انکار فعل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ فعل کا تودہ پہلے اعلان کر چکے تھے اور خود پوچھنے والوں میں ایک ایک فرد جانتا تھا کہ انہی کا کیا دھرا ہے۔ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ محض جھٹ اڑامی تھی اور جھٹ اڑامی کا وہ طریقہ ہے ہمارے مناظر فرض الباطل مع لعضم حتیٰ ”ملزم الْجَحَّةِ“ سے تعبیر کرتے ہیں صدق و کذب کا سوال کیونکہ پیدا ہو سکتا ہے؟“

(ترجمان القرآن، جلد 2، ص 499)

پوری بحث نہایت عالمانہ اور مدلل ہے لیکن تنگ دامانی کے پیش نظر ہم سارا بیان نقل نہیں کر سکتے۔ ہاں ”صحت“ اور ”عصمت“ سے متعلق مولانا کی یہ نادر تحقیق و تحلیل ضرور پیش کرنا چاہیں گے:

”تیرہ سو برس کے اندر کسی مسلمان نے راویان حدیث کی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ نہ امام بخاری و مسلم کو معصوم تسلیم کیا ہے۔ کسی روایت کے لئے بڑی سے بڑی بات جو کہی گئی ہے۔ وہ اس کی ”صحت“ ہے ”عصمت“ نہیں ہے۔ اور ”صحت“ سے مقصود صحت مصطلک فن ہے۔ نہ کہ صحت قطعی و یقینی مثل صحبت قرآن، پس ایک روایت پر صحبت کی کتنی ہی مہریں لگ پکھی ہوں۔ لیکن بحال غیر معصوم انسانوں کی ایک شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ ہر بات کے لئے مفید جھٹ ہو سکتا ہے۔ مگر یقینیات و قطعیات کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ جب کبھی ایسا ہو گا کہ کسی راوی کی شہادت یقینیات قطعیہ سے معارض ہو جائے گی۔ تو یقینیات اپنی جگہ سے نہیں ہیں گے۔ غیر معصوم کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی۔“ (ترجمان القرآن۔ ص 499 تا 500)

جمهور کا خوف اور ذہن میں الفاظ کا استعمال

کچھ غیر اسلامی نظریات اور تفسیری افسانے امت مسلمہ کے ذہن و قلوب میں اس قدر رنج بس گئے ہیں۔ کہ ان کے خلاف کچھ کہنا گویا اسلام کے اصل الاصول سے انحراف بن جاتا ہے۔ عموم تو عوام خواص بھی ایسی آواز کو کفر و ارتاد تک جا پہنچاتے ہیں۔ بہت ہی کم ہیں جو علی الاعلان حق کو صحیح اور ناحق کو غلط کہنے کی جرأت و ہمت رکھتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول نے مسلمان کو یہی تعلیم دی ہے کہ وہ جمہور کا خوف چھوڑ کر خدا خونی ہی کو مد نظر رکھے۔ بات صاف اور کھری کرے، ذہن میں الفاظ سے اجتناب کرے۔ کیونکہ یہ نفاق اور مذاہت تک پہنچا دیتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد علی نے ہمیشہ اسی اصول کو مد نظر رکھا، تفسیر کرتے وقت صرف اور صرف قرآنی الفاظ کی پیروی کی، جمہور یا مسلکی نظریات کو بھی حاوی ہونے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کی ”ترجمان القرآن“ مولانا محمد علی کی ”بیان القرآن“ سے زیادہ مختلف نہیں۔ لیکن مولانا محمد علی کے مقابل مولانا آزاد زیادہ پیباک اور غذر نہیں۔ جو بات تحریریات یا تفسیریات میں کھل کر تسلیم کرتے ہیں، اسی بات کو ”ترجمان القرآن“ میں یا تو گول کر جاتے ہیں یا پھر ذہن میں الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:-

وفات مسیح

مولانا آزاد مرحوم اور سید سلیمان ندوی مرحوم نے مولانا محمد علی مرحوم سے بال مشافہ ملاقات کے دوران صاف اقرار کیا کہ مسیح ناصری عیسیٰ علیہ السلام وفات پاچکے ہیں۔ اس لئے دوبارہ دُنیا میں لوٹ کر نہ آئیں گے (دیکھو رسالہ ”دعوتِ عمل“ از قلم حضرت مولانا محمد علی۔ طبع ششم۔ ص ۲۵)۔ مولانا آزاد نے یہ بات بعض احمدی مبلغوں کو لکھ کر بھی دی تھی۔ مشہور احمدی مبلغ مولانا عمر الدین صاحب شملوی مرحوم (جو جماعت الہمدیت سے آئے تھے) اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں، کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک خط ہمارے پاس موجود ہے جس میں وہ وفات مسیح کے معترف ہیں۔ (دیکھو پیغام صلح لاہور۔ ۱۹۳۸ء۔ ص ۸)۔ اس مقالہ کے شائع ہونے کے بعد بھی مولانا آزاد دس سال زندہ رہے، انہوں نے اسکی بھی تردید نہ فرمائی۔ لیکن مولانا موصوف کی تفسیر ”ترجمان القرآن“ پڑھنے والا کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا کیونکہ وہاں

انہوں نے اپنی سارہ انہ زبان دانی کا بھر پور مظاہرہ کیا ہے تاکہ جمہور میں ہیٹھ نظر نہ آئیں:-
 اِذْ قَالَ اللَّهُ يَعِيْسَى اِنِّي مُتَوَقِّيْكَ وَرَافِعُكَ إِلَىٰ وَمُطَهَّرُكَ مِنَ
 الَّذِيْنَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ
 الْقِيَمَةِ۔ (آل عمران۔ آیت 55)

اور (پھر) جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ نے فرمایا تھا ”اے عیسیٰ! میں تیرا وقت پورا کروں گا، تجھے اپنی طرف اٹھا لوں گا، تیرے منکروں (کی تھتوں) سے تجھے پاک کروں گا۔ اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے، انہیں قیامت تک تیرے منکروں پر برتری دوں گا۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمْرُتُنِي بِهِ أَنْ أَعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ
 عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيَتِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ مُطْ
 وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۔ (المائدہ۔ آیت 117)

میں نے تو ان سے صرف وہی بات کی، جس کے کہنے کا تو نے حکم دیا تھا۔ یعنی اللہ کی بندگی کرو، میرا اور تھمارا، سب کا پورا دگارو ہی ہے۔ جب تک میں ان میں رہا، ان کا نگران حال تھا۔ جب تو نے میرا وقت پورا کر دیا، تو پھر تو ہی ان کا نگہبان تھا۔ اور تو ہر چیز کو دیکھنے والا اور اس کی نگہبانی کرنے والا ہے۔

وَمَا قَشْلُوْهُ وَمَا صَلْبُوْهُ وَلِكُنْ شُبَّهَ لَهُمْ وَمَا قَشْلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ
 رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ۔ (النساء آیت 157) (الہدیۃ۔ آیت 158)

حالانکہ (واعظ یہ ہے کہ) انہوں نے نہ قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھا کر ہلاک کیا۔ بلکہ حقیقت حال اُن پر مشتبہ ہو گئی (یعنی صورت حال ایسی ہو گئی کہ انہوں نے سمجھا، ہم نے مسیح کو مصلوب کر دیا۔ حالانکہ نہیں کر سکتے تھے..... اور یقیناً یہودیوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا۔“

شُبَّهَ لَهُمْ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:-

”آیت میں جس اشتباہ کا ذکر ہے اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ حضرت مسیح کی شخصیت

مشتبہ ہو گئی اور ان کی جگہ کسی دوسرے آدمی کو سولی پر چڑھا دیا۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ حضرت مسیح کی موت مشتبہ ہو گئی۔ وہ زندہ تھے مگر انہیں مردہ سمجھ لیا۔“

(ترجمان القرآن، جلد اول، ص 431)

تینوں مقامات کا ترجمہ اور تشریح پڑھنے کے بعد بھی قاری یہ سمجھ نہیں پاتا کہ مولانا موصوف کا اپنا خود کا عقیدہ کیا ہے، یا یہ کہ قرآن مجید کی روشنی میں حیات مسیح کو ماناجائے یا وفات مسیح کو مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک دریہ نہ کرم فرمانے یہی گلہ اپنے مکتوب میں کیا ہے:-

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ ہی مولانا آپ کے ہاتھ کی تحریر دیکھی ہوئے مدت ہو گئی۔ آنکھوں کو انتظار نے پیمار کر دیا، برہ کرم ایک کتاب مدلل اور مفصل لکھ دیں جس کے بعد روز روز آپ کے سیکرٹری کو کسی تردید کی ضرورت پیش نہ آئے۔ کیا معنی یہ مرزا میں لوگ آپ کی طرف مختلف معاملات منسوب کرتے رہتے ہیں۔ اور بعض حوالہ جات بھی دیتے ہیں۔ مثلاً تذکرہ، ”وکیل“، ”غیرہ۔“ کبھی کہتے ہیں مولانا وفات مسیح کے قائل ہیں۔ کبھی کہتے ہیں مولانا نے مرزا صاحب کی تعریف کر دی ہے۔ برہ کرم ایسی فیصلہ کن کتاب لکھ دیں کہ پھر بولنے کی جرأت نہ رہے اور اس میں یہ بھی درج فرمادیں کہ اسکے ذریعہ تمام پرانی تحریریں منسوخ اور پرانے خیالات بھی تاکہ پرانی باتوں کے ذکر کی گنجائش نہ رہے۔ (المکلف (ڈاکٹر) انعام اللہ خان سالار پرنٹر 2101 کوچ خوشی محمد بلوجہستان)

جواب از قلم مولانا آزاد : (۱) وفات مسیح کا ذکر خود قرآن میں ہے۔

(۲) مرزا صاحب کی تعریف یا برائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ تو برا ہے تو بھلا ہونہیں سکتا اے ذوق

وہ برا خود ہے جو تمھ کو برا جانتا ہے

(ملفوظات آزاد۔ مرتبہ محمد اجمل خان۔ 129 تا 130۔ مطبوعہ کراچی)

یہی عبارت ”مولانا آزاد ایک سیاسی ڈائری“ کے صفحہ ۵۲۲ پر چھپی ہے۔ جس کو دھولیہ (مہاراشٹر) کے اثر بن یکی انصاری نے ۱۹۸۲ء میں مرتب کیا۔

مطلوب ایک دم صاف ہے۔ یعنی نہ توفات مسیح ہی کا انکار ہو سکتا ہے، اور نہ ہی حضرت مرزا صاحب کو برآ کہا جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ مولانا موصوف نے یہاں اپنی کسی بھی پرانی تحریریا

رائے یا تحریر کو کا لعدم قرار نہیں دیا۔ مولانا کی یہ تحریر ان کے آخری ایام کی ہے۔
بعینہ یہی روشن مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنائی ہے۔ زبان سے وفات مسح کا اقرار تو
نہیں کرتے۔ لیکن جملے ایسے استعمال کرتے ہیں جن سے وفات مسح کا اظہار صاف نمایاں
ہے۔ انکی مشہور و معروف تفسیر ”تدبر القرآن“ کے یہ مقامات ملاحظہ فرمائیں:
”جس طرح دنیا میں بہت سے رسول گزرے ہیں۔ اسی طرح ﷺ بھی اللہ کے ایک رسول
ہیں۔ جس طرح کی آزمائشیں اور مصیبیتیں دوسرے رسولوں کو پیش آئیں اسی طرح کی
آزمائشیں اور مصیبیتیں انہیں بھی پیش آسکتی ہیں۔ جس طرح تمام رسولوں کو موت کے مرحلہ
سے گزرنا پڑا انہیں بھی ایک دن وفات پانے ہے۔“

(تدبر القرآن۔ جلد ۳۔ صفحہ ۱۸۵۔ زیر آیت ۱۲۲:۳)

”جس طرح آیت ۱۵ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیحؑ سے متعلق ان کی زندگی اور موت کے
ہر مرحلہ میں سلام و تھیث کی بشارت دی ہے۔ اسی طرح یہ حضرت مسحؑ نے اپنی ولادت، موت
اوربعثت کے ہر مرحلہ میں اپنے لئے قدوسیوں کے سلام اور ان کی تھیث کی خبر دی ہے۔ اس
آیت سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہے کہ ولادت، موت اور موت کے بعد اٹھائے جانے کے
مراحل سے جس طرح ہر بشر گزرتا ہے اور گزرے گا اسی طرح سیدنا مسحؑ بھی گزرے اور
گزریں گے۔ اس باب میں ان سے متعلق مغضّ تفسیری روایات کی بنابر کوئی ایسی بات فرض
کر لینا اختیاط کے بالکل خلاف ہے۔ جس کی کوئی سند قرآن میں نہیں ہے۔“

(تدبر القرآن۔ جلد ۲۔ ص ۲۸۹۔ سورہ مریم آیت ۳۳ کا شریح نوٹ)
مولانا امین احسن اصلاحی کے شاگرد رشید پروفسر غامدی نے کھلے عام وفات مسح کا اعلان
کر دیا ہے۔ یوں یوب پر اسکا ویڈیو کلپ بھی دستیاب ہے۔

حضرت سلیمانؑ اور ہوا

قرآن شریف میں آتا ہے:-

وَلِسُلَيْمَنَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَرَكَنَا فِيهَا۔

(الأنبياء: 81)

مولانا محمد علی کا ترجمہ : ”اور ہم نے سلیمان کے لئے تیز چلنے والی ہوا کو (کام میں لگادیا)۔ وہ اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی تھی۔“

ملتان (پاکستان) کے ادارہ تالیفات اشرفیہ نے حال ہی میں ”گلدستہ تقاضہ“ کے نام سے ایک ضخیم اردو تفسیر سات جلدیوں میں شائع کی ہے۔ اس تفسیر کو ”دور حاضر کی مستند تقاضہ سیر کا جامع خلاصہ“ بتایا گیا ہے۔ اس میں زیر بحث آیت کے تحت یہ عبارت ملتی ہے :

”تفسیر ابن کثیر میں تخت سلیمان علیہ السلام جو ہوا پر چلتا تھا اس کی کیفیت یہ بیان کی ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے لکڑی کا ایک بہت بڑا وسیع تخت بنایا تھا، جس پر خود مجمع اعیان سلطنت اور مع لشکر اور آلات حرب کے سوار ہو جاتے۔ پھر ہوا کو حکم دیتے وہ اس عظیم الشان وسیع و عریض تخت کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا ہاں جا کر اُنہوں نے تھی۔ یہ ہوائی تخت صبح سے دو ہر تک ایک مہینہ کی مسافت طے کرتا تھا۔ اور دو پہر سے شام تک ایک مہینہ کی۔ یعنی ایک دن میں دو مہینوں کی مسافت ہوا کے ذریعہ طے ہو جاتی تھی۔ ابن ابی حاتم نے حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ اس تخت سلیمانی پر تجھے لاکھ کر سیال رکھی جاتی تھیں۔ جس میں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اہل ایمان انسان سوار ہوتے تھے۔ اور ان کے پیچھے اہل ایمان جن بیٹھتے تھے۔ پھر پرندوں کو حکم ہوتا کہ وہ پورے تخت پر سایہ کر لیں، تاکہ آفتاب کی تیش سے تکلیف نہ ہو۔ پھر ہوا کو حکم دیا جاتا تھا وہ اس عظیم الشان مجمع کو اٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا پہنچا دیتی تھی۔۔۔“

تفسرین کرام کے عجیب و غریب بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا محمد علی اپنی شاہکار تفسیر بیان القرآن میں لکھتے ہیں :-

”قرآن کریم ان قصوں سے پاک ہے اور ہوا کا حضرت سلیمان کے لئے مسخر ہونا یہی ہے کہ آپ کے کام میں معاون تھی۔ جس طرح ہوا سے مدد ملا کرتی ہے۔ اور غالباً تَجْرِيٰ يَأْمُرُه (وہ اس کے حکم سے چلتی تھی) میں اس ہوا کے کشتیاں چلانے کی طرف اشارہ ہے۔ یا خود کشتیوں کا چلنا مراد ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہوائے موافق یا باد بانوں وغیرہ کے استعمال سے جہاز دُور دُور کا سامان لیکر ملک شام میں جو

ارض مبارک ہے آتے تھے۔ چنانچہ یہودی انسکلو پیدیا میں ہے کہ غنچ فارس اور غنج عقبیہ کے درمیان حضرت سلیمان کے جہاز چلتے تھے اور اس تجارت سے ملک میں سونا اور دولت بہت بڑھ گئی تھی۔ اور یہی وجہ حضرت سلیمان کی شان و شوکت کی تھی۔

قرآن شریف میں دوسری جگہ آتا ہے۔ **وَسَخَّرَ لِكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ**۔ (ابراهیم: 32) ترجمہ ”اور کشتیوں کو تمہارے کام میں لگایا تاکہ وہ سمندر میں اُس کے حکم سے چلیں۔“ اور ہو سکتا ہے کہ یہاں بھی **بِأَمْرِهِ** (اس کے حکم سے) میں اشارہ امر الٰہی کی طرف ہی ہو۔ اور یہاں ریجع (ہوا) کو عاصفۃ (تیز چلنے والی) کہا ہے۔ اور دوسری جگہ تَجْرِيَ بِأَمْرِهِ رُخَاءً (ص: 36) ترجمہ: وہ اس (اللہ) کے حکم سے نرمی سے چلتی تھی۔ تو مطلب یہ ہے کہ وہ رتک عاصفہ ایسی نہ تھی کہ نقصان پہنچاتی ہو۔ باوجود تیز ہوا ہونے کے اس میں نرمی پائی جاتی تھی۔

(بیان القرآن: ص 910- ۲۱۷۵ فٹ نوٹ)

اب مولانا آزاد کا ترجمہ اور تشرییجی حاشیہ ملاحظہ فرمائیں:

ترجمہ: اور (دیکھو) ہم نے (سمندر کی) سُنَدَہ ہواں کو بھی سلیمان کے لئے مسخر کر دیا تھا کہ اُس کے حکم پر چلتی تھیں۔ اور اس سرز میں کے رُخ پر جس میں ہم نے بڑی ہی برکت رکھ دی ہے۔ یعنی فلسطین اور شام کے رُخ پر جہاں (بحر احمر اور بحر متوسط سے دور دُور کے جہاڑ آتے تھے)۔

تشریح: آیت 81 میں فرمایا، ہم نے سمندر کی باد تنہ سلیمان کے لئے مسخر کر دی تھی۔ یعنی باد بانی کے بڑے بڑے جہاز چلنے لگے تھے۔ اور خشکی کے جانوروں کی طرح سمندر کی ہواں میں بھی ان کے لئے بار بداری اور نقل و حرکت کا ذریعہ ہو گئی تھی۔ قدیم عہدوں میں حضرت سلیمان پہلے شخص ہیں جنہوں نے جہاڑوں سے اسی طرح کام لینا شروع کیا کہ ہندوستان اور مغربی جزائر تک بحری آمد و رفت کا منظم سلسہ قائم ہو گیا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تجارتی بیڑا وقت کا سب سے طاقتور بیڑا تھا۔

(ترجمان القرآن۔ جلد ۲۔ ص 480 تا 481)

دیوبند کے مولانا شبیر احمد عثمانی قدیم مفسروں کی رائے سے متفق ہیں اور اختلاف رائے کرنے والوں پر طزو طعن کرتے ہیں۔ جبکہ مولانا امین احسن اصلاحی ”تدریس القرآن“ میں مولانا محمد علی کی تشریح سے متفق ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کے شیاطین

وَمِنَ الشَّيَاطِينِ مَنْ يَغُوصُونَ لَهُ وَيَعْمَلُونَ عَمَالًا دُوْنَ ذِلِكَ . وَكُلَّا لَهُمْ حَفِظِينَ . (الأنبياء 21: آیت 82)

ترجمہ: مولانا محمد علیؒ۔ اور کئی سرکش جواس کے لئے غوطہ زنی کرتے اور اس کے سواۓ اور کام بھی کرتے تھے اور ہم ان کی حفاظت کرنے والے تھے۔

ترجمہ مولانا فتح محمد جalandھری : اور دیوؤں (کی جماعت کو بھی ان کے تابع کر دیا تھا کہ ان) میں سے بعض ان کے لئے غوطے مارتے تھے اور اس کے سوا اور کام بھی کرتے تھے۔ اور ہم ان کے نگہبان تھے۔

تشریح از حضرت مولانا محمد علیؒ : شیاطین۔ شیطان ہر سرکش کو کہتے جن ہو یا انسان..... قرآن کریم میں شیاطین الانس (الانعام ۱۱۲: ۶) بالنصرۃ مذکور ہیں۔ اور کئی جگہ پر خود مفسرین نے بالاتفاق شیاطین سے مراد صرف سردار یعنی انسان لئے ہیں۔ جیسے وَإِذَا خَلَوَا إِلَى شَيْطَنِهِمْ (ابقرہ 2: 14) اور حالانکہ یہاں غوطہ زنی کا صاف ذکر ہے۔ جو کام ہمیشہ سے انسان کرتے چلے آئے ہیں۔ اور اب بھی کرتے ہیں۔ مفسرین کو یہ اصرار ہے کہ یہ سچ مجھ کے شیطان ہی تھے، جو غوطہ زنی کرتے تھے۔ اور پھر کُلَّا لَهُمْ حَافِظِينَ (ہم ان کے نگہبان تھے) میں یہ قصہ بنایا گیا ہے کہ ان شیطانوں پر ایک گروہ ملائکہ کا اور مومن جنہوں کا حفاظت کے لئے مقرر تھا۔ اور پھر وہ شیطان سچ مجھ معماروں کا کام بھی کرتے تھے: وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَاءٍ وَغَوَّاصٍ (ص 38: آیت 37)۔ ترجمہ: اور شیطانوں کو ہر ایک معمار اور غوطہ زن کو (ان کے کام میں لگایا)۔ گویا وہ زمانہ ایسا تھا کہ جتنے کام آج کل انسان کرتے ہیں اُس وقت وہ شیاطین کیا کرتے تھے۔ اور شیاطین اس وقت بدی کے محرك نہ تھے اور یہ قانون اللہ تعالیٰ

کا پچھے بنا کہ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْجُرُ مِنَ ابْنِ ادَمَ مَجْرُى الدَّمِ (حدیث)۔ (یعنی شیطان انسان میں اس طرح پھرتا ہے جیسے خون پھرتا ہے۔) صاف اور سادہ الفاظ کو عجبہ بنانے سے اور قرآن کریم کے سادہ بیانات میں عجیب و غریب قصے داخل کرنے سے قرآن کریم کی عظمت برہنی نہیں بلکہ اس سے اُسے نقصان پہنچتا ہے۔ اور کاریگروں کو شیاطین اس لئے کہا کہ وہ سرکش قوموں میں سے تھے۔ جنہیں سلیمان نے فتح کر کے مغلوب کیا تھا اور بعض کو ان میں سے قید کر کے کام لیا جاتا تھا۔ جیسا کہ وَآخَرِينَ مُقْرَرَنِينَ فِي الْأَصْفَادِ (ص 38: آیت 38) (ترجمہ اور اوروں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔) سے ظاہر ہے۔ اس لئے كُنَّا لَهُمْ حَافِظِينَ بھی فرمایا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت نہ ہوتی تو ان سے کام لینا آسان نہ تھا۔

(بیان القرآن - ص 911 تا 910 - فٹ نوٹ 2176)

اب ہم مولا نا ابوالکلام آزاد کی طرف آتے ہیں:-

آیت کا ترجمہ: ”اور شیطانوں میں سے ایسے شیطان، جو اس کے لئے غوطے لگاتے۔ اور اس کے علاوہ اور بھی طرح طرح کے کام کرتے۔ اور ہم انہیں اپنی پاسبانی میں لئے ہوئے تھے۔“

تشریح: ”قرآن میں شیطان کا اطلاق شیاطین الجن پر بھی ہوا ہے۔ اور شیاطین الانس پر بھی۔ مثلاً اَنَّمَا ذَلِكُمُ الشَّيْطَنُ يُحَوِّفُ أُولَيَاءَ (آل عمران: آیت 174) میں شیطان سے مقصود قریش مکہ کا بھیجا ہوا جاؤں ہے۔ یا وَإِذْ رَزَّيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ (الانفال: 48: آیت 8) میں شیطان کا اطلاق سرaque بن مالک ابن حشم پر کیا گیا۔ جو قریش کو لڑائی پر ابھارتا تھا، مگر پھر بھاگ گیا۔ پس یہاں آیت (82) میں بھی معلوم ہوتا ہے، شیاطین کا اطلاق شیاطین الانس ہی پر ہوا ہے۔ یعنی فلسطین اور شام کی ان شریر اور سرکش قوموں پر جو حضرت سلیمان کے عہد میں بالکل مطع و منقاد ہو گئی تھیں۔ اور انہوں نے ہیکل کی تعمیر میں تیرہ برس تک ہر طرح کی خنت سخت خدمتیں انجام دی تھیں۔ ہیکل کی بنیاد حضرت داؤد نے ڈالی دی تھی۔ لیکن تعمیر حضرت سلیمان نے کی، تورات کی کتاب سلطانیں اول سے معلوم ہوتا ہے کہ تمیں ہزار آدمی تیرہ برس تک کام پر لگے رہے۔ تب

کہیں جا کر عمارت تیار ہوئی،” (ترجمان القرآن۔ جلد 2۔ ص 482)

آیات قرآنی کے ترجمہ میں پوری احتیاط

ممبین کی ڈاکٹر صالح صاحب نے حضرت مولانا محمد علی کی ’بیان القرآن‘ کا جو غیر جانب دارانہ تجزیہ پیش کیا ہے، اُس کو ہم پیچھے نقل کرچکے ہیں۔ اُس تجزیے میں انہوں نے کچھ ریمارک ایسے لکھے ہیں جن کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ہم انہیں یہاں پھر سے نقل کرنا چاہیں گے۔

(۱) ترجمہ سلیمانی ہوتے ہوئے ادبی ممتازت لئے ہوئے ہے۔

(۲) لسانی حیثیت سے فصاحت اور شستگی ہے۔

(۳) یہ ترجمہ و تفسیر ”غلط عقائد“ کی ترجمانی سے تقریباً خالی ہے۔

(۴) یہ ترجمہ پوری احتیاط اور خلوص سے کیا گیا ہے۔

مفسر قرآن مولانا عبدالmajid ریاضی داری نے بالکل یہی بات دو مختصر ترین جملوں میں بیان کی ہے۔ ترجمہ کی بات آئی تو ”قابل قدر“ کہ دیا اور تفسیر کے متعلق فرمایا : ”اسلام اور قرآن کی حقانیت کا فتش دل پر ثابت کر دینے والی۔“ یہ دونوں بیان جس بھی ترجمہ و تفسیر کو نصیب ہو جائیں تو اُس کے مفید، متندا و معترف ہونے میں کلام نہیں۔ فالحمد لله علی ذالک۔

تفسیر کی کچھ جملکیاں ہم اور دکھا چکے ہیں، اب ترجمہ کی ندرت اور شان ملاحظہ فرمائیں:

(۱) سورۃ الْفَاتِحۃ کی آیت۔ اہدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمُ۔ کا ترجمہ عام طور پر یوں کیا جاتا ہے۔ ”ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔“

اس پر آریہ سماج والوں کا یہ اعتراض ہے کہ خدا تعالیٰ کی حمد کرنے والا، اس کی صفات رب، رحمان، رحیم اور مالک کا اقرار کرنے والا، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُسی اکیلے کی عبادت کرنے والا، صرف اُسی اکیلے سے مدد طلب کرنے والا، اگر ایسا انسان بھی یہ کہے کہ ”مجھے سیدھا راستہ دکھا“ تو اور پر وال اسرا قول و اقرار اور عمل عبث ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہی دوسری جگہ آتا ہے۔ وَإِنْ عَبْدُونَيْ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيْمٌ (بیان 36: آیت 61) اور کہ میری عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ

ہے۔ سیدھا راستہ پالینے کے بعد بھی خدا سے یہ کہنا کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا، یقین کی کمی اور ایمان کی ناقچتگی کی علامت ہے۔ مولانا محمد علیؒ نے اس اعتراض کو ترجمہ ہی میں ختم کر دیا : - ”تو ہم کو سیدھے رستے پر چلا“

اور قصیری حاشیہ میں بتادیا کہ ہدایت کے حقیقی معنی ”راستہ دکھانا، اُس پر چلانا اور منزل تک پہنچانا“ میں۔ اب انگریزی کے لگ بھگ سمجھی متوجہین نے ”اہدنا“ کے ترجمہ میں مولانا محمد علیؒ ہی کا اقتداء کیا ہے۔ ما بعد کے اردو تراجم میں بھی یہی نسب نظر آنے لگی ہے۔
 (۲) سورۃ البقرہ آیت ۶ میں آتا ہے۔ **إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ وَإِنَّ رَبَّهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ.**

ترجمہ: ”بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان کے لئے برابر ہے، وہ ایمان نہیں لا سکیں گے۔“ (ترجمہ مولانا ڈاکٹر محمد حسن خان)
 ”جو لوگ کافر ہیں، انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لئے برابر ہے، وہ ایمان نہیں لانے کے۔“ (مولانا فتح محمد جالدھری)

”جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لئے یکساں ہے۔ ڈراؤ یا نہ ڈراؤ ، وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔“ (مولانا امین حسن اصلحی)

”جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے لئے برابر ہے کہ آپ انہیں (عذاب خدا سے) ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لا سکیں گے۔“ (شیعہ ترجمہ مولانا سید صدر حسین بنجپی)
 ”بے شک جنہوں نے کفر پالیا ہے ان کے لئے برابر ہے خواہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لا سکیں گے۔“ (مولانا طاہر القادری)

مطلوب یہ کہ جو ایک بار کافر ہو گئے ان کے لئے تیراڑانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔ وہ ایمان نہیں لا سکتے۔ حالانکہ یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ اس سے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا ہی مشن نعمود باللہ بیکار ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا محمد علیؒ نے لکھا ہے:

”سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ وَإِنَّ رَبَّهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرُهُمْ۔ (آن کے لئے برابر ہے کہ تو ان کو

ڈرائے یانہ ڈرائے) جملہ معرضہ ہے جو انَّ الَّذِينَ كَفَرُوا، کی حالت کو بیان کرتا ہے۔ بحراً محیط اور وح المعانی میں اس ترکیب کی صحت کو تسلیم کیا گیا ہے۔.....پس اصل معنی یوں ہیں کہ جنہوں نے کفر کیا اور ایسا کفر کیا کہ ان پر تیراً ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔ وہ ایمان نہیں لاتے اور یہ حق بھی ہے جو شخص ڈرانے کی پروانہیں کرتا وہ کبھی فائدہ نہیں اٹھاسکتا۔ ہاں جب دل کی اس حالت کو تبدیل کر لیتا ہے تو پھر وہ بھی فائدہ اٹھالیتا ہے۔ یہ حکم ایک خاص حالت پر ہے کسی خاص انسان پر نہیں۔” (بیان القرآن۔ ص ۱۳۔ فٹ نوٹ۔ ۷۱)

اب آیت کے ترجمہ کو ملاحظہ فرمائیں:-

”جنہوں نے انکار کیا (یہاں تک) کہ ان کے لئے برابر ہے کہ تو ان کو ڈرائے یانہ ڈرائے وہ نہیں مانتے۔“ (محمد علی)

بعینہ یہی بات مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمہ میں کہی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:-

”(لیکن) وہ لوگ جنہوں نے (ایمان کی جگہ) انکار کی راہ اختیار کی (اور سچائی کے سنبھالنے اور قبول کرنے کی استعداد کھو دی) تو (ان کیلئے ہدایت کی تمام صدائیں بیکار ہیں) تم انہیں (انکار حق کے نتائج سے) خبردار کرو یا نہ کرو، وہ مانے والے نہیں۔ (ترجمان القرآن۔ جلد ۱۔ ص 257)

اب ذرا دنوں ترجموں پر نگاہ ڈالئے۔ مولانا محمد علی کا ترجمہ کتنا منظر، صحیح، روای اور تحت لفظ ہے۔ اس کے مقابل مولانا آزاد مرحوم نے کس قدر ایزادی جملوں کو بروکار لایا ہے۔ بہر حال ترجمے میں ”انکار“ لفظ کے برعکس انتخاب واستعمال نے سونے پر سہا گہ کا کام کر دیا ہے۔ اس سے ترجمے کی شان دو بالا ہو گئی ہے۔

(۳) سورہ ھود (آیت 34) میں آیا ہے:

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِحَىٰ إِنَّ أَرَدْتُ أَنْ أَنْصَحَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغُوِّثُكُمْ.

ترجمہ: ”اوہ تمہیں میری نصیحت نفع نہیں دے گی اگر میں چاہوں کہ تمہیں نصیحت کروں جبکہ اللہ تعالیٰ تمہیں گمراہ کرنا چاہتا ہو۔“ (ترجمہ اکرم حسن خان)

”اوہ اگر میں یہ چاہوں کہ تمہاری خیر خواہی کروں اور خدا یہ چاہے کہ تمہیں گمراہ کرے

تو میری خیرخواہی تم کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔” (ترجمہ مولانا فتح محمد)

گمراہ کرنا شیطان کا کام ہے۔ اللہ کا نہیں۔ ہاں پارسی مذہب میں اہم من کا بنیادی وصف بدی کو تحریک دینا ہی ہے۔ جبکہ قرآن کریم کی صریح اور واضح تعلیم یہی ہے کہ اللہ کی پاک ذات کی طرف کسی برے وصف کی نسبت ہو بھی نہیں سکتی۔ اس لئے یہاں ”غَوَى“ کو گمراہی کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا۔ مولانا محمد علی ”بیان القرآن“ میں لکھتے ہیں:-

امام راغب کہتے ہیں۔ **الْغُيُّ جَهَلٌ مِنْ اغْتِقَادٍ فَاسِدٍ**. یعنی غیّ وہ جہالت ہے۔ جو اعتقد فاسد سے پیدا ہو۔ اسی لئے عَصْمَى اَدُمْ رَبُّهُ فَغَوَى (اط 20: آیت 121) آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی پس ناکام ہوا) میں غوی کے معنی جَهَلَ کئے گئے ہیں۔ اور غوی کے معنی خَابَ یعنی ”ناکام رہا“ بھی کئے گئے ہیں۔ اور فَسَدَ عَيْشَةَ بھی یعنی ”اس کی زندگی خراب ہو گئی“۔ **إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيْكُمْ** (ہود 34) میں یُغْوَى کے معنی دو طرح پر کئے گئے ہیں۔ **يُعَافِيكُمْ عَلَى عَيْشَكُمْ** یعنی تمہاری غی کی تمہیں سزادے یا **يَحْكُمُ عَلَيْكُمْ بِغَيْشَكُمْ** یعنی تمہاری غی کا تم پر حکم لگائے (مفادات راغب و تاج العروس)۔ پس **إِغْوَأْهُ** (بدی کی تحریک کرنا، دوسرے کو بدرہ پر لگانا) والے معنی اللہ کے لئے قطعاً جائز نہیں۔ سارے قرآن کریم میں کسی جگہ بھی یہ ذکر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے (شیطان کو 16:2 میں) نافرمانی کا حکم دیا تھا۔ بلکہ حکم تو فرمانبرداری کا ہی دیا تھا۔” (بیان القرآن۔ جلد 1۔ ص 505۔ فٹ نوٹ 1058)

زیر بحث آیت کریمہ کا ترجمہ:-

”او تمہیں میری نصیحت لفظ نہیں دے سکتی اگر میں چاہوں کہ تمہاری خیرخواہی کروں، اگر اللہ کا ارادہ ہو چکا ہو کہ وہ تمہیں ہلاک کرے۔“ (محمد علی)

ترشیح : **يُغْوِيْكُمْ** (بحث اور نقل ہو چکی ہے۔ خورشید) ایک انسان کی خیرخواہی دوسرے کے کام نہیں آسکتی جب وہ خود غلط راہ پر قدم مارتا ہوا اتنی دور تک جائے کہ اللہ تعالیٰ اس پر گمراہ ہونے کا یا ہلاکت کا حکم لگا دے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسا حکم اسی وقت لگاتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ ایک شخص اپنی اصلاح کسی صورت میں نہیں کرتا۔“ (بیان القرآن: ص 651۔ فٹ نوٹ: 1460)

اب مولا نا آزاد کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

”اور اگر اللہ کی مشیت یہی ہے کہ تمہیں ”ہلاک“ کرے تو میں کتنا ہی نصیحت کرنا چاہوں، میری نصیحت کچھ سودمند نہ ہوگی۔“ (ترجمان القرآن۔ جلد 2۔ ص 190)

تعجب ہے کہ علامہ رحمت اللہ طارق نے اپنی ”برہان القرآن“ میں مولا نا آزاد کے اس ترجمہ کی نسبت یہ کیسے لکھ دیا۔

”یہاں اغو و آء کے معنی جب ہلاک ٹھہرے تو کچھ بعینہ نہیں کہ امام ابوالکلام آزاد (1958م) کو اس معنی کا پتہ چل گیا ہو یا بصیرتِ قرآنی آپ کو اس طرف لے گئی ہو۔“ (برہان القرآن۔ ص 501)

جبکہ یہی بات پھیس سال پہلے مولا نا محمد علی ”بیان القرآن“ میں کہہ چکے تھے۔
(۲۴) قرآن پاک میں آتا ہے:-

إِذْ قَالَتِ الْمَلِئَكُ يَمْرِيمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكُلِّمَةٍ مِنْهُ أَسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُفَرَّقَيْنِ. (آل عمران۔ 45:3)

ترجمہ: ”جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمے کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ وہ دُنیا اور آخرت میں بڑے مرتبے والا اور اللہ کے قریبی بندوں میں سے ہوگا۔“ (ڈاکٹر محمد نمان)

علامہ رحمت اللہ طارق لکھتے ہیں:-

”کلمہ کے معنی کہ اللہ سبحانہ مریم کو ایک کلمہ کی بشارت دیتے ہیں۔ گویا مسیح اللہ تعالیٰ کا ایک کلمہ ہیں۔ یعنی اللہ کا جز کیونکہ کلمہ متكلّم کا جزو ہوتا ہے۔ اس سے مسیحی عقیدے کی تائید ہو جاتی ہے۔“ (طارق)

”تو یہ نظر کا پھیر ہے اور قرآن کسی کے ”نظر کے پھیر“ کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا، کہ وہ ”عربی مبین“ ہے۔ اس نے ”کلمہ“ کا لفظ استعمال کر کے ”مفسروں“ اور ”مسیحیوں“ کی سوچ کا سد باب کر دیا ہے۔ کیونکہ ”کلمہ“ کا لفظ مونث ہے اور مسیح علیہ السلام ”مذکر“ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بالغ نظر مترجموں اور سانیات عرب کے

جو ہر یوں نے مسیح کو ”کلمۃ اللہ“ تسلیم نہیں کیا۔“ (برہان القرآن ص 263)

مولانا محمد علی نے زیر نظر آیت کریمہ کا ترجمہ یوں کیا ہے:-

”فرشتوں نے کہا : اے مریم! اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلام کے ساتھ خوشخبری دیتا ہے۔ اس (مبشر) کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے۔ جو دنیا اور آخرت میں وجہت والا اور مقربوں میں سے ہوگا۔“

مولانا آزاد کا ترجمہ یہ ہے:-

”اور (پھر) جب ایسا ہوا کہ فرشتوں نے کہا : ”اے مریم،“ اللہ تجھے اپنے کلام کے ذریعہ (ایک لڑکے کی) بشارت دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ ہوگا اور مریم کا بیٹا کھلائے گا۔ دنیا اور آخرت، دونوں میں ارجمند ہوگا۔“ (ترجمان القرآن، جلد 1 ص 351)

بقول علامہ طارق یہ قرآن پاک کی ایسی غیر معمولی اور صحیح ترجمانی ہے، جو عربی نژاد مصنفوں کو بھی میسر نہیں۔

1995ء میں ایک نامور پاکستانی عالم جناب صدر حسین صدیقی کی ایک تصنیف بنام ”قرآن اور انسان“ منظر عام پر آئی، جس کو پاکستان کے مشہور پبلشیر فیروز سمنزلہ ہورنے شائع کیا۔ مصنف نے کتاب میں نہایت قابلیت سے قرآن کریم کی آیات کے ذریعہ زندگی کے مختلف مسائل اور نظریات پر وہشی ڈالی ہے۔ کتاب میں آیات قرآنی کا اردو ترجمہ مولانا محمد علی کی بیان

قرآن سے لیا گیا ہے۔ اور دیباچہ میں ایسا کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھا ہے :

”آیات کا ترجمہ زیادہ تر مولانا محمد علی مرحوم کے ترجمہ قرآن سے حاصل کیا گیا ہے۔ کیوں کہ وہ قرآن مجید کا بڑی حد تک لفظی ترجمہ ہے۔ ترجمانی نہیں۔ اور اس وجہ سے یہ مشیت ایزدی کو اردو زبان میں زیادہ بہتر طور پر بیان کرتا ہے۔“

(قرآن اور انسان ص ۲۹۔ از صدر حسین صدیقی۔ ناشر فیروز سمنزلہ ہور)

مفسر قرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جو بھی قاری مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ”تفہیم القرآن“ کو مولانا محمد علی لاہوری کی

”بیان القرآن“ کے ساتھ ملا کر پڑھے گا، وہ خود جان جائے گا کہ مولانا مودودی نے کس حد تک مولانا محمد علی کی اتباع کی ہے۔ جہاں بھی انہوں نے مولانا محمد علی کی رائے یا تشریح سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔ وہیں انکی تفسیر اپنے اعلیٰ مقام سے ہٹ کر دیقا نویسیت کی ادنیٰ سطح پر آگئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض احباب کو ہمارا یہ ریمارک نا گوار اور کڑوا لگے۔ ہم اپنے بیان کی تائید میں مندرجہ ذیل شواہد اور ثبوت پیش کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱)۔ مولانا محمد علی لاہوری نے اپنی شہرہ آفاق انگریزی تفسیر کی طرح اپنی مایہ ناز اردو تفسیر ”بیان القرآن“ میں بھی ہر سورت کے آگے اُس سورت کا ایک سلسلہ ہوا تعارفی انٹروڈکشن (Introduction) دیا ہے۔ جس کا خاکہ کہ اس طرح ہے:

۱۔ سورت کا نام۔ اس میں وجہ تسمیہ اور نام میں موجود خصوصیت کو زیر بحث لا یا گیا ہے۔

۲۔ خلاصہ مضمون۔ اس میں پوری سورت کے مضماین کا نجوذ اور ان میں پائی جانے والی تعلیم اور خصوصی نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رکوعوں کا باہمی ربط اور تال میل۔

۳۔ زیر بحث سورت کا پچھلی اور اگلی سورت سے تعلق۔ اور مصحف قرآنی میں موجودہ مقام پانے کی وجہ اور اس میں پہاں فلاسفی۔

۴۔ زمانہ نزول۔ اس میں تاریخی شواہد اور شان نزول وغیرہ کا بیان آ جاتا ہے۔

بالکل یہی نجح اور طریقہ مولانا مودودی صاحب نے ”تفہیم القرآن“ میں اختیار کیا ہے۔ اُن کے تمہیدی نوٹ کا خاکہ کچھ اس طرح ہے:

۱۔ نام اور وجہ تسمیہ

۲۔ زمانہ نزول

۳۔ شان نزول

اب ہم اصل ترجمہ اور تفسیر کی طرف آتے ہیں :

حروف مقطعات۔ تمام متدائل تراجم میں ان حروف کو اسرار الہی کہا گیا ہے۔ جن کے معنی سوائے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اس مضمون میں مولانا محمد علی لاہوری کا تفسیری نوٹ یوں ہے:

”یہ حروف جو بعض سورتوں کی ابتداء میں آتے ہیں مقطعات کہلاتے ہیں۔۔۔ عام طور پر ترجموں میں ان کے معنی نہیں کئے جاتے۔ حالانکہ صحابہ سے ثابت ہے کہ یہ حروف الفاظ کے قائم مقام ہیں۔ اور حروف سے الفاظ کی طرف اشارہ کرنا تمام زبانوں میں مروج ہے۔ آج کل انگریزی میں تو یہ رواج بہت ہی بڑھا ہوا ہے۔ عرب میں بھی یہ دستور تھا۔ چنانچہ اس مصروف میں **فُلْتُ لَهَا قِفْيٌ** **قَالْتُ قَافٌ**۔ ق کے معنی قَدْوَقَفْثٌ ہیں یعنی میں ٹھہر گئی۔ اور بھی کئی مثالیں اس کی ہیں۔ مگر عربی میں کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا کہ فلاں حرف سے فلاں لفظ کی طرف اشارہ ہوگا۔ بلکہ سیاق و سبق سے معلوم کیا جاتا تھا۔ اس لئے قرآن کریم میں بھی یہ ضروری نہیں کہ ایک جگہ جو معنی ایک حرف کے لئے گئے ہیں دوسری جگہ بھی وہی ہوں۔ ہاں جو مجموعہ ایک ہی طرح پر آیا ہے اس کا مفہوم ایک ہی ہے۔ جیسے الٰم کہ اس سورت کے علاوہ پانچ اور سورتوں کی ابتداء میں ہے۔۔۔ الٰم کے معنی حضرت ابن عباسؓ سے **أَنَّ اللَّهَ أَعْلَمُ مَرْوِيًّا** ہیں یعنی میں اللہ بہت جانے والا ہوں۔“

(بیان القرآن۔ جلد اٹھ نوٹ ۸)

اب مولانا مودودی صاحب کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں:

”یہ حروف مقطعات قرآن مجید کی بعض سورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں۔ جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اُس دور کے اسالیب بیان میں اس طرح کے حروف مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا۔ خطیب اور شعراء دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اب بھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں ان میں اسکی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ اس استعمال عام کی وجہ سے **مقطعات کوئی** جیتنے تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو۔ بلکہ سامعین بالعلوم جانتے تھے کہ ان سے مراد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے خلاف نبی ﷺ کے ہم عصر مخالفین میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض کیا کہ یہ مخفی حروف کیسے ہیں۔ جو تم بعض سورتوں کی ابتداء میں بولتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام سے بھی

ایک کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ سے ان کے معنی پوچھے

ہوں۔ بعد میں یہ اسلوب عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا اور اس بنا پر مفسرین کے لئے ان کے معنی تعین کرنا مشکل ہو گیا۔۔۔ ایک عام ناظر کے لئے کچھ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان کی تحقیق میں سرگردان ہو،“

(تفسیر القرآن۔ جلد اس-۳۹۔ فٹ نوٹ ۱)

اس طرح مولانا مودودی نے قدامت پسند علماء اور جدید روشن خیال قاریوں، دونوں ہی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مولانا کے اس بیان سے قاری کے دل میں یہ خلش اور شدید حسرت ضرور پیدا ہوتی ہے کہ آج کے مسلمانوں سے اُس دور کے کافر لوگ زیادہ خوش قسمت تھے جنہیں کم سے کم حروف مقطعات کے معنی تو سمجھ میں آ جاتے تھے۔ اور یہ کہ صحابہ کرام بھی قرآنی مطالب اور تفسیر کی امانت پوری طرح الگی نسلوں کے حوالے نہ کر پائے۔

سورہ بقرہ کی آیت ۲۲ میں آتا ہے :

وَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاخْرَجَ بِهِ مِنَ الشَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ

جس کا ترجمہ عام طور پر یوں کیا جاتا ہے :

”اور بر سیا آسمان سے پانی پھر پرده عدم سے نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے۔“ (ترجمہ مولانا تھانوی)

”اور آسمان سے پانی اُتارا، تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو۔“ (ترجمہ۔ مولانا احمد رضا خان)

”اور اُتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کئے پھل تمہاری روزی کے لئے۔“ (ترجمہ مولانا امین حسن اصلاحی)

حضرت مولانا محمد علی لاہوری کا ترجمہ یہ ہے :

”اوہ اپر سے بافی اُتارا، پھر اس کے ساتھ تمہارے لئے پھلوں سے رزق نکالا۔“

اب مولانا مودودی کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں :

”اوہ اپر سے بافی بر سیا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بھم پہنچایا۔“

سورۃ البقرہ کی آیت ۱۹ اور ۲۰ کے تحت جو تشریحی حاشیہ مولانا محمد علی نے لکھا ہے وہ یہ ہے:
 ”بہرا۔ گونگا۔۔۔ اندھا۔ مجازی معنی مراد ہیں۔ یعنی کلمہ حق سنتے نہیں نہ کہتے
 ہیں۔ نشانات صداقت دیکھتے نہیں۔ یہ شدید نفاق والے ہیں جو حق کی شناوائی اور بینائی
 سے ہی محروم ہو چکے ہیں۔ یا منافقوں کے سردار ہیں اور دوسری مثال والے ان کے پیرو
 ہیں۔ یا وہ جن کا نفاق محض بزدی اور کمزوری کی وجہ سے ہے۔“

پھر آگے پل کر لکھتے ہیں :

”اس تمثیل میں صیب یا رحمت کی بارش سے مراد وحی الہی ہے۔ اندر ہیرے سے مراد
 مشکلات ہیں جو وحی الہی کے قبول کرنے میں پیش آتی ہیں۔ کڑک سے مراد بعض خوفناک
 امور ہیں جیسے مثلاً دشمنوں کے حملے۔ جن سے کمزور دل خائف ہو جاتے ہیں۔ چمک سے
 مراد وہ کامیابیاں ہیں جو مطلع کروشن کر دیتی ہیں۔ یہ دوسری قسم کے منافق ہیں۔ جو بالکل
 اپنی روشنی نہیں کھو چکے، مگر ان کے اندر کچھ کمزوری ہے۔ کوئی مشکلات سامنے آ جاتی ہیں
 تو فوراً گھبرا جاتے ہیں۔ دشمن کی طرف سے تیاری دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ بس اب
 مارے گئے۔۔۔“

(بیان القرآن۔ جلد اول۔ فٹ نوٹ۔ ۳۰ اور ۳۱)

اب ”تفہیم القرآن“ کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں :
 ”پہلی مثال اُن منافقین کی تھی جو دل میں قطعی مغفرت تھے۔ اور کسی غرض و مصلحت سے
 مسلمان بن گئے تھے۔ اور یہ دوسری مثال اُنکی ہے جو شک اور تذبذب اور ضعف ایمان
 میں بتلاتھے۔ کچھ حق کے قائل بھی تھے۔ مگر ابی حق پرسی کے قائل نہ تھے کی اس کی خاطر
 تکلیفوں اور مصیبتوں کو بھی برداشت کر جائیں۔ اس مثال میں بارش سے مراد اسلام
 ہے۔۔۔ مثال کے آخری حصہ میں ان منافقین کی کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب
 معاملہ ذرا اہل ہوتا ہے تو یہ پل پڑتے ہیں اور جب مشکلات کے ڈال باڈل چھانے لگتے
 ہیں یا ایسے احکام دیتے جاتے ہیں جن سے ان کی خواہشات نفس اور ان کے تعصبات
 جاہلیت پر ضرب پڑتی ہے تو ٹھہر کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

(تفہیم القرآن جلد اول۔ ص ۵۶)

یہ بالکل وہی بیان ہے جو بیان القرآن، میں آیا ہے۔ اس پیرایہ اور الفاظ بدل گئے ہیں۔
فرشتوں کا وجود۔ حضرت مولانا محمد علی لکھتے ہیں :

”...ملگ بمعنی رسول ہے۔۔۔ ملائکہ نورانی ہستیاں ہیں جن کو یہ آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ اور وہ اللہ کی طرف سے رسول یعنی وسائط ہیں۔ مسلمانوں میں سے بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ ملائکہ صرف قوتوں و طاقتوں کا نام ہیں۔ حتیٰ کہ نبوت کو بھی ایک ملکہ یا طاقت قرار دیکر اس کا نام جبرایل قرار دیا ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے بھی یہ عقیدہ رکھنا پڑتا ہے کہ وہی الہی انسان کے اندر سے ہی ایک آواز کے پیدا ہونے کا نام ہے۔ اور وہ کوئی خارجی شے نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ کے انسان سے کلام کرنے کا ذکر ہے وہاں اگر کلام کی ایک صورت یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ دل میں ایک بات ڈال دیتا ہے۔ تو دوسری صورت من ورآی الحجاب فرمائی اور تیسری یہ کہ وہ رسول صحیح کراپنا کلام پہنچاتا ہے۔ جہاں رسول سے مراد جبرایل ہی ہے۔ پس اگر یہ مغض اندر کی شے ہوتی تو یہ تیسری صورت قطعاً ناممکن تھی۔۔۔ علاوه ازیں دنیا کے بڑے بڑے راستبازوں کی شہادت اس بات پر ہے کہ ملائکہ علیحدہ ہستیاں ہیں۔۔۔ ملائکہ کا علیحدہ ہستیاں ہونا ہی صحیح خیال ہے۔۔۔“

(بیان القرآن۔ جلد اول۔ فٹ نوٹ ۲۵)

”تفہیم القرآن“ کا نوٹ یوں ہے:

”ملک کے اصل معنی عربی میں ”پیامبر“ کے ہیں۔ اسی کا لفظی ترجمہ فرستادہ یا فرشتہ ہے۔ یہ مغض مجرد قوتیں نہیں ہیں، جو شخص نہ رکھتی ہوں۔ بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہستیاں ہیں جن سے اللہ اپنی اس عظیم الشان سلطنت کی تدبیر و انتظام میں کام لیتا ہے۔۔۔“

(تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ ص ۲۲۔ فٹ نوٹ ۳۷)

رفعنا فوقكم الطور

وَإِذَا خَلَدْنَا مِنْتَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ طَخُذُوا مَا أَتَيْنَاهُمْ بِقُوَّةٍ

(۲:۶۳)

”یاد کرو وہ وقت جب ہم نے طور کوم پر اٹھا کر تم سے پختہ عہد لیا تھا۔ کہ جو کتاب ہم تھیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھا مانا۔۔۔“ (تفہیم ۲:۶۳)

”اور جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا (کہ تورات پر عمل کریں گے) اور ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر (محاذات میں) معلق کر دیا کہ (جلدی) قول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی کے ساتھ۔۔۔“ (ترجمہ تھانوی)

”اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور تمہارے اوپر پہاڑ بلند کیا، جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے زور سے پکڑ رکھو۔۔۔“ (ترجمہ محمد علی)

لفظ پرست علماء بھی کہتے ہیں کہ سچ مجھ پہاڑ کو اٹھا کر بنی اسرائیل کے اوپر معلق کر دیا گیا، اور کہا گیا کہ حق کا اقرار کرو۔ اللہ کے دین میں اس زبردستی کے عہدو اقرار کی اہمیت اور وقعت کیا ہو سکتی ہے؟ مولا نامحمد علی لکھتے ہیں:

”رفعنا فوقكم الطور کے معنی نہیں کہ پہاڑ کو پانی جگہ سے اٹھا کر اونچا کیا۔ بلکہ یہ کہ تم نیچے تھے اور پہاڑ اوپر اٹھا ہوا تھا۔۔۔“

”اس آیت کے یہ معنی کرنا کہ بنی اسرائیل کے سروں پر پہاڑ لا کر معلق کر دیا گیا تھا کہ اگر تم ان احکام کا نہ مانو گے تو ابھی پہاڑ تمہارے سروں پر آپڑے گا۔ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے لا اکراه فی الدین۔ جب انسان کو حکم ہے کہ دین میں جرنہ کرے تو خود خدا کا جر کرنا کیا معنی۔ علاوہ ازیں اس جر کا تو یہی جواب بنی اسرائیل کی طرف سے کافی ہے کہ ہم نے اقرار کوئی نہیں کیا۔ ڈرا کر اقرار لیا گیا۔ ایسا اقرار تو کسی عدالت میں بھی تسلیم نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف ان کو یاد دلایا ہے کہ جب حضرت موسیٰ پر احکام نازل ہوئے تو اس وقت بنی اسرائیل کے بزرگ پہاڑ کے نیچے موجود تھے۔۔۔ تورات میں یہ الفاظ ہیں : ”اور موسیٰ لوگوں کو خیمه گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملا دے۔ اور وے پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے“ (خرونج ۱۹:۱۷)۔ اور ان کو حکم تھا کہ نیچے ہی رہیں اور حضرت موسیٰ کے ساتھ اور پر نہ آئیں (خرونج ۲۳:۱۹)۔“

(بیان القرآن۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۷)

مولانا مودودی لکھتے ہیں :

”بس مجملًا یوں سمجھنا چاہئے کہ پہاڑ کے دامن میں بیثاق لیتے وقت ایسی خوفناک

صورت حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آن پڑے گا۔۔۔” (تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ صفحہ ۸۳)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور تین جھوٹ۔ اس موضوع پر ہم پچھے بحث کرائے ہیں۔ اس معاملے میں مولانا مودودی نے بھی مولانا محمد علی ہی کا موقف اختیار کیا ہے اور بخاری شریف کی متعلقہ حدیث کو غلط ٹھہرایا ہے۔ مولانا مودودی کا حاشیہ خاصاً طویل اور عالمانہ ہے۔ فقط چند جملے اپنے نمونہ پیش خدمت ہیں:

”بِقُصْمَتِي سَمِّيَتْ كَيْ رِوايَتْ مِيْ مِيْ يَهْ بَاتْ آَجَئِيْ ہَےْ كَهْ حَضَرْ اَبْرَاهِيمْ نَيْ اَپَنِي زَنْدَگِيْ مِيْ تَيْنِ جَھَوْتْ بُولَےْ ہَيْ۔۔۔ يَهْ حَدِيثْ۔۔۔ صَرْفْ اَسِيْ وَجَهْ سَمِّيَتْ قَابِلْ اَعْتَراَضْ نَبِيْنِ ہَےْ كَهْ يَأَيْكِيْ كَوْ جَھَوْتْ قَارَادَرْ رَهِيْ ہَےْ۔ بلکہ اس بنا پر بھی غلط ہے کہ اس میں جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تینوں ہی محل نظر ہیں۔۔۔ کیا یہ کوئی معقول بات ہے کہ جس حدیث کا متن ایسی باقتوں پر مشتمل ہواں کو بھی ہم نبی ﷺ کی طرف منسوب کرنے پر صرف اسلئے اصرار کریں کہ اس کی سند مجرور نہیں ہے؟۔۔۔“

(تفہیم القرآن۔ جلد ۳۔ صفحہ ۱۶۸ تا ۱۶۹)

ذوالقریبین کون تھا۔ اس پر بھی ہم پچھے بحث کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا مودودی کا بیان

یہ ہے :

”یہ مسئلہ قدیم زمانے سے اب تک مختلف فیہ رہا ہے۔۔۔ قدیم زمانے میں بالعموم مفسرین کامیلان سکندر کی طرف تھا۔ لیکن قرآن میں اسکی جو صفات و خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ مشکل ہی سے سکندر پر چسپاں ہوتی ہیں۔ جدید زمانے میں تاریخی معلومات کے بنا پر مفسرین کامیلان زیادہ ترایران کے فرمان رواخور (خسر و یاسائرس) کی طرف ہے۔ اور یہ نبتابازیادہ قرین قیاس ہے۔“ (تفہیم القرآن۔ جلد ۳۔ صفحہ ۲۳۲ و ۲۳۳)

یہ بات سب سے پہلے حضرت مولانا محمد علی لاہوری نے کہی، مولانا ابوالکلام آزاد نے مزید تاریخی تحقیقات کے ساتھ اسے آگے چلا یا۔ اب یہ نظریہ قبول عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔

یاجوج اور ماجون کون ہیں؟ حضرت مولانا محمد علی لاہوری لکھتے ہیں:

”بعض کے نزدیک وہ یافتہ بن نوح کی اولاد سے دو قبیلے ہیں اور ترک بھی انہیں میں سے ہیں، جو دیوار سے ادھر چھوڑا جانے کی وجہ سے ترک کہلانے اور کعب احبار سے روایت ہے کہ یا جون ماجون آدم کی اولاد میں سے ہیں مگر تو اسے نہیں (روح المعانی)۔ پس یا جون ماجون نسل انسانی میں سے ہیں۔ اور ان کے متعلق جو بعض الفاظ احادیث میں آتے ہیں، جن سے بعض کو یہ خیال گزرتا ہے کہ وہ ہماری طرح کے آدمی نہیں، تو لازماً وہ استعارہ کے رنگ کے ہیں۔ اور اس بارہ میں سب روایات قبل قبول بھی نہیں۔ مثلاً قول جو حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے کہ ان کے قد ایک بالشت اور دو بالشت یا زیادہ تین بالشت ہیں۔ یا یہ کہ ان میں سے ایک مرتا ہے تو ایک ہزار ذریت چھوڑتا ہے۔۔۔ یہودی انسائیکلوپیڈیا میں ہے کہ جوزیفس ان کو ہی قوم بتاتا ہے جو ستھین کہلاتی ہیں اور جزوی کہتا ہے کہ میگاگ (ماجون) کوہ قاف سے پرے بھیرہ خضر کے قریب تھا۔ انسائیکلوپیڈیا بری ٹھیکہ بھی اسی رائے کا موئند ہے یعنی انہیں ستھین قویں قرار دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ شمال کی بہت سی اقوام میں سے کسی ایک یا سب پر اس لفظ کا استعمال ہو سکتا ہے۔ باطل میں ہے : ”خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدمزاد تو جون کے مقابل جو ماجون کی سرزی میں کا ہے اور روشن اور مسک اور توبال کا سردار ہے اپنا منہ کرا اور اس کے برخلاف نبوت کرا اور کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھے اے جوں روشن اور مسک اور توبال کے سردار میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے پھر ادونگا اور تیرے جبڑوں میں بنیاں ماروں گا“ (حزقی ایل۔ ۳۸:۱۲)۔ یہاں تین نام یا جون ماجون کے ذکر میں آئے ہیں : روشن، مسک اور توبال۔ مفسرین باطل ایسے صریح الفاظ سے گھبرا کر ان ناموں کو ایشائے کوچک میں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں روشن سے مراد روں نہیں۔ کیوں، اس لئے کہ اس صورت میں پیشگوئی اپنے ہی گھر کے خلاف ثابت ہوتی ہے۔ مگر واقعات ایسے زبردست ہیں کہ اسے سامنے یہ انکار قائم نہیں رہ سکتا۔ یا جون ماجون کا کوہ قاف کے شمال میں ہونا ایک امر مسلم ہے۔ جس کو یہودی انسائیکلوپیڈیا اور انسائیکلوپیڈیا بری ٹھیکہ دونوں میں تجھ تسلیم کیا گیا ہے۔ اب ایشائے کوچک میں ان ناموں کو تلاش کرنا عبث کوشش ہے۔ کوہ قاف کے شمال میں روں بھی ہے اور مسک اور توبال بھی موجود ہیں۔ موخر الذکر دونوں ناموں کے دو دریا (مسکو اور توبال) کوہ قاف کے شمال میں ملک روں میں بہہ رہے ہیں اور ان میں اول پر ماسکو

کا قدیم شہر آباد ہے۔ اور موخر الذکر پر توبالسک۔ اور یہ لئنی امر ہے کہ یاجون یا یاجون جس کا
یہاں ذکر ہے اس سے مراد روس ہی ہے۔ نہ کچھ اور۔ پس یا یاجون ماجون میں سے ایک روس
ہے یا سلانی قوموں کا مسکن۔ آیا یاجون ٹیوٹن قوموں کا مسکن ہے یا نہیں۔ گواں کی تائید میں
کوئی دلائل پیش نہیں کر سکتا۔ مگر اقوام یورپ کے ایک حصہ پر اس صراحت سے یاجون کا نام
صادق آنا، جو خود بائبل اور انسائیکلو پیڈیا سے ثابت ہے، کوئی شک باقی نہیں رہنے دیتا کہ
ماجون سے مراد بھی انہی قوموں کا کوئی دوسرا بڑا عظیم الشان حصہ ہے۔ اور لندن کے گلڈہال
کے سامنے یا یاجون اور یاجون کے بتوں کا نصب ہونا، جن کی اصلیت بھی بہت پرانے زمانے
کی بتائی جاتی ہے۔ یعنی اس قسم کے بت ہنری خامس کے زمانے میں بھی موجود تھے۔ بتاتا ہے
کہ جس نتیجہ پر ہم پہنچ ہیں وہی درست ہے اور ممکن ہے کہ ابتداء میں ان قوموں کے باہم
تعاقبات بھی ہوں یا یہ ایک ہی قوم کی دو شاخیں ہوں۔“

(بیان القرآن۔ جلد ۲۔ فٹ نوٹ ۱۹۶۰)

اور ذوالقرنین کی دیوار سے متعلق اپنی تحقیق و تدقیق کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :
”یہ بیان کچھ شبہ باقی نہیں رہنے دیتا کہ جس دیوار کا ذکر قرآن شریف میں ہے یہی دربند کی
دیوار ہے جو قاف کی شتمی قوموں کو ایران پر حملہ آور ہونے سے روکنے کے لئے بنائی گئی
تھی۔ جنہیں نہ صرف قرآن شریف یا یاجون ماجون قرار دیتا ہے بلکہ خود مورخین بھی انہی
کو یاجون ماجون قرار دیتے ہیں۔“ (ایضاً۔ فٹ نوٹ ۱۹۶۲)

مولانا محمد علی کی اس طویل رسیروچ کے نتائج کی صحت اور صداقت سے مولانا مودودی کو بھی
اتفاق ہے۔ چنانچہ نام لئے بغیر ہی ساری باتیں دوہرا دیتے ہیں :

”یہ تو قریب قریب متفق ہے کہ یا یاجون و ماجون سے مراد شتمی چین کے وہ قبائل ہیں جو تاتاری
، منگولی، ھن اور سیچین وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اور قدیم زمانے سے متعدد ممالک
پر حملے کرتے رہے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ ان حملوں سے پچنے کیلئے قفقار (کا کیشیا) کے
جنوبی علاقے میں دربند اور داریاں کے استحکامات تعمیر کئے گئے تھے۔“

(تفہیم القرآن۔ جلد ۲۔ ص ۲۲)

حضرت یحیٰؑ کے والد حضرت زکریاؑ نبی نہ تھے۔ سبھی مفسرین حضرت یحیٰؑ کے

والدگرامی یعنی حضرت زکریاؑ کو نبی مانتے آئے ہیں۔ لیکن مولانا محمد علی کی ریسرچ نے انہیں غیر نبی ثابت کیا۔ یہ ایک بہت بڑا اور غیر معمولی انشاف تھا۔ مولانا محمد علی لکھتے ہیں :

”زکریاؑ حضرت یحیٰؑ کے والد کا نام ہے اور یہ نام قرآن کریم میں زمرہ انبیاء میں بھی آتا ہے۔ لوقا: ۵ میں زکریاؑ کے متعلق ذیل کے الفاظ ہیں : ”یہودیہ کے باڈشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں سے زکریاؑ نام کا ہن تھا اسکی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی۔ اور وہ دونوں خدا کے حضور استباز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانونوں پر بے عیب چلنے والے تھے۔“۔۔۔ انا جیل میں زکریاؑ کو صرف کا ہن بیان کیا گیا ہے۔ البتہ پُرانے عہد نامے میں ایک نبی زکریاؑ نام بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کی کتاب بھی مجموعہ عہد نامہ قدیم میں موجود ہے۔ پس ممکن ہے کہ جہاں قرآن کریم نے زکریاؑ کو زمرہ انبیاء میں فرمایا (الانعام ۶: ۸۵)۔ وہاں اشارہ زکریاؑ کی طرف ہی ہو کیونکہ جہاں زکریاؑ کو انبیاء میں سے گناہے وہاں ان کے ہاں یحیٰؑ کے پیدا ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔ اور جہاں زکریاؑ کے یہاں یحیٰؑ کے پیدا ہونے کا ذکر ہے۔ جو تین جگہ آیا ہے یعنی یہاں (آل عمران۔ آیت ۷۳) اور سورہ مریم میں اور سورہ انبیاء میں، وہاں زکریاؑ کو نبوت عطا فرمانے کا کوئی ذکر نہیں۔ اور زکریاؑ اور زکریاؑ دونوں ناموں میں اس قدر مشابہت ہے کہ عربی میں آکرانکا ایک ہی صورت اختیار کر لینا کوئی بعید بات نہیں۔ بلکہ بعض مقامات کے الفاظ قرآنی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ امر کہ مریم قرمع اندازی سے زکریاؑ کی سپردگی میں آئیں۔ اگر وہ نبی ہوتے تو کاہنوں پر خود ان کا حق فائق ہوتا۔ یا زکریاؑ کا یحیٰؑ کے متعلق دعا کرتے ہوئے یہ کہنا یَرِثُنَّ وَيَرِثُ مِنْ أَلِيْعَقُوبَ (مریم ۱۹: ۶) میر اوارث ہو اور آل یعقوب کا اوارث ہو۔ ظاہر ہے کہ نبوت کی طرف اشارہ آل یعقوب میں ہے۔ ورنہ یہ شی کافی تھا۔ ایسا ہی سورہ انبیاء میں زکریاؑ اور اسکی بی بی کا اکٹھا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے : اَنَّهُمْ كَانُوا يُسْرِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَا رَغَبًا وَرَهَبًا (الانبیاء: ۲۱)۔ وہ بھلاکیوں میں ایک دوسرے سے

آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور ہم کو امید اور خوف رکھتے ہوئے پکارتے تھے۔ ان قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زکریا نبی اور زکریا والدِ میخی دو الگ الگ شخص ہیں۔“

(بیان القرآن۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۰۲۔ فٹ نوٹ ۳۱۱)

یہ رائے مولا نا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی قبول کی ہے۔ لکھتے ہیں:

”حضرت زکریا جن کی تربیت میں وہ (یعنی حضرت مریم۔ ناقل) دی گئی تھیں، غالباً رشتے میں ان کے خالو تھے۔ اور یہ کل کے مجاہر میں سے تھے۔ یہ وہ زکریا نبی نہیں ہیں جن کے قتل کا ذکر بابل کے پرانے عہد نامے میں آیا ہے۔“

(تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ ص ۲۸۴)

مولانا مودودی کے پیچ و تاب

مولانا محمد علی نے بیان القرآن میں متعدد آیات بینات سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت کی ہے۔ مولا نا موصوف کے دلائل اس قدر ٹھوس اور قوی ہیں کہ ان کو توڑنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولا نا آزاد، مولا نا سید سلیمان ندوی، مولا نا عبد اللہ سنہدی، علامہ اقبال، مولا نا شبیل نعمانی، علامہ محمد اسد، مولا نا وحید الدین خاں جیسے مشاہیر نے صاف الفاظ میں وفات مسیح کا اعلان کر دیا ہے۔ اور بقول صاحب ”برہان القرآن“ علامہ رحمت اللہ طارق وفات مسیح کے تاپک پر احمدیوں نے اتنا مادا کٹھا کر دیا ہے کہ اس میں کسی مزید اضافے کی قطعاً گنجائش نہیں۔ لیکن مولا نا مودودی نے قدامت پرستی کا بھونڈا مظہرہ کرتے ہوئے لکھنے کو تو نکھدیا:

”جو لوگ قرآن کی آیات سے مسیح“ کی وفات کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل یہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ میاں کو صاف سمجھی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب ظاہر کرنے تک کا سلیقہ نہیں ہے۔ اعاذ نا اللہ ممن ذا لک“ (تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۵۸)

لیکن تفہیم القرآن میں آگے چل کر خود ہی اس الزام کو اپنے سر لے لیا۔ لکھتے ہیں :

”قرآن نہ اس کی تصریح کرتا ہے کہ اللہ نے ان کو (یعنی حضرت عیسیٰ کو۔ ناقل) جسم وروح کے ساتھ کرہ زمین سے اٹھا کر آسمانوں پر کہیں لے گیا۔ اور نہ یہی صاف کہتا ہے کہ انہوں نے زمین پر طبعی موت پائی اور صرف ان کی روح اٹھائی گئی۔ اس لئے قرآن

کی بنیاد پر نہ تو ان میں سے کسی ایک پہلو کی قطعی نفعی کی جاسکتی ہے اور نہ اثبات۔“

(تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ ص ۲۲۰)

کیا مولانا مودودی کے اس بیان سے یہ ثابت نہیں ہوتا ”کہ اللہ میاں کو (نعواز باللہ) صاف سلبی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب ظاہر کرنے تک کا سلیقہ نہیں ہے۔“ اسی لئے جو کوئی چاہے اس کے فرمودات سے اپنے حسب منشا و مقصد مفہوم نکال لے۔

حق تو یہ ہے کہ جہاں جہاں مولانا مودودی نے مولانا محمد علی کی رائے اور تشریح سے اتفاق کیا ہے وہاں ان کی تفسیر میں روشن خیالی اور جدت کی غیر معمولی چمک آشکارا ہو جاتی ہے۔ اور جہاں انہوں نے ان کی رائے سے اختلاف دکھایا، وہیں دینی انسیت اور قدامت پرستی نمایاں ہو گئی ہے۔ ہم اپنی بات کو ایک مثال سے صاف کرنا چاہتے ہیں:

سورۃ آل عمران میں آتا ہے :

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْفَرُّجُ طَلِلَّدِينَ
أَخْسَنُوا إِنْهُمْ وَأَنْقَوْا أَجْرًُ عَظِيمٌ

”وہ جنہوں نے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی اس کے بعد کہ انہوں نے زخم کھایا، جنہوں نے ان میں سے احسان کیا اور تقویٰ کیا ان کے لئے بڑا اجر ہے۔“

(آل عمران۔ آیت ۲۷۔ اترجمہ محمد علی)

”اس آیت میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ غزوہ ہجراء اللہ کے نام سے موسوم ہے۔ أحد کے واقعہ سے اگلے ہی دن نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں میں یہ منادی کرائی کہ ہم دشمن کے تعاقب میں نکلنے والے ہیں۔ چنانچہ جس قدر آدمی ساتھ چل سکتے تھے وہ ساتھ ہو لئے۔ ادھر ابوسفیان روحاء کے مقام تک پہنچا تو مشرکین ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ نہم نے محمد ﷺ کو قتل کیا نہ تمہارے ہاتھ کوئی قیدی آئے۔ اس لئے انہوں نے مشورہ کیا کہ واپس لوٹ کر پھر مسلمانوں کو بتاہ کریں۔ مگر ابھی اسی سوچ میں ہی تھے کہ ان کو خوب پہنچی کہ مسلمان ائمہ کے تعاقب میں آرہے ہیں۔ اس پروہ ایسے مرعوب ہوئے کہ وہاں سے فوراً کوچ کیا اور مکہ کو چلے گئے۔ اور نبی کریم ﷺ یہ معلوم

کر کے کہ وہ بہت دور نکل گئے ہیں۔ حمراء الاسد سے مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے واپس آگئے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ نبی کریم صلعم اور آپؐ کے صحابہؐ کس قدر باہم قوم تھی کہ اس قدر تکلیف دشمن کے ہاتھ سے اٹھا کر پھر بھی اس کا تعاقب کیا۔۔۔“
(بیان القرآن۔ جلد اول۔ ص ۲۹۰۔ فٹ نوٹ ۵۶۸)

اس موقع پر مولا نا مودودی نے جو حاشیہ لکھا ہے، وہ یوں ہے:
”جنگ احمد سے پہل کرجب مشرکین کئی منزل دور چلے گئے تو انہیں ہوش آیا اور انہوں نے آپس میں کہا یہ ہم نے کیا حرکت کی کہ محمدؐ کی طاقت کو توڑ دینے کا جو بیش قیمت موقعہ ملا تھا اسے ہو کر چلے آئے۔ چنانچہ ایک جگہ ٹھہر کر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ مدینہ پر فوراً ہی دوسرا حملہ کر دیا جائے۔ لیکن پھر ہمت نہ پڑی اور مکہؐ واپس چلے گئے۔ ادھرنی علیہ السلام کو بھی یہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ کہیں پھر نہ پہٹ آئیں۔ اس لئے جنگ احمد کے دوسرے ہی دن آپ نے مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ کفار کے تعاقب میں چنانچا ہیے۔ یہ اگرچہ نہایت نازک موقع تھا۔ مگر پھر بھی جو سچے مومن تھے وہ جان ثار کرنے لئے آمادہ ہو گئے۔ اور نبی علیہ السلام کے ساتھ حمراء الاسد تک گئے جو مدینہ سے ۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس آیت کا اشارہ انہی فدا کاروں کی طرف ہے۔“
(تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ صفحہ ۳۰۳)

پھر اگلی دو آیتوں میں آتا ہے :

الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشُوْهُمْ فَرَأَدُهُمْ إِيمَانًا طَوَّقُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ (۲۷) (۱) فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَمْ يَمْسَسُهُمْ سُوءٌ وَّاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ

”وہ جن کو لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے (مقابلے کے) لئے (لشکر) جمع کیے ہیں پس ان سے ڈرو، تو اس (بات) نے انکا ایمان بڑھایا اور انہوں نے کہا اللہ ہمارے لئے کافی ہے، اور کیا ہی اچھا کار ساز ہے۔ پس وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس آئے انہیں کوئی دکھ نہ پہنچا اور انہوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی اور اللہ بڑے فضل والا

ہے۔” (ترجمہ محمد علی)

ان آیتوں سے جو حقائق نکھر کر سامنے آتے ہیں، وہ یہ ہیں :

(۱) دشمن کے بھیجے ہوئے ایجٹ نے مسلمانوں کو یہ کہہ کر ڈرایا کہ ان پر حملہ کرنے کے لئے

بخاری لشکر جمع ہو رہے ہیں۔

(۲) دشمن کی فوج کے مقابلے تم تعداد اور جنگی قوت میں کم ہواں لئے جنگ کا خیال ترک

کر دو۔ اور مقابلہ کے لئے نہ نکلو۔

(۳) دشمن کے اس نفیاتی پر اپینگڈے نے مسلمانوں کو کسی بھی طرح مروعہ یا پست

بہت نہیں کیا۔ بلکہ اس کا اثر بالکل اٹھا پڑا۔ ان کا ایمان یعنی اللہ پر بھروسہ اور زیادہ ہو گیا۔

(۴) انہوں نے یک زبان ہو کر یہی نعرہ بلند کیا۔ ”اللہ ہمارے لئے کافی ہے، اور وہ کیا

ہی اچھا کار ساز ہے۔“

(۵) ادھر اللہ نے بھی اپنے غیبی اسباب سے ایسے موقع پیدا کر دیئے جن کی بدولت

مسلمان اللہ کی نعمت اور فضل سے مالا مال ہو کر لوٹے۔ اور انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچی۔

چنانچہ ان آیتوں کی تشریح کرتے ہوئے مولانا محمد علی بیان القرآن میں لکھتے ہیں :

”جب ابوسفیان اُحد کے میدان سے چلا تو اس نے باواز بلند کہا کہ اے

محمد (صلعم) ہمارے اور تمہارے درمیاں اگلے سال بدر صفری پر جنگ ہوگی۔ سو جب

اگلا سال آیا تو ابوسفیان اپنی قوم کے ساتھ نکلا جب مہراظہر ان کے مقام پر پہنچا تو اس

کا دل مروعہ ہو گیا اور اس نے واپسی کی ٹھان لی۔ اتنے میں نعیم ابن مسعود انجی سے

ملاتو ابوسفیان نے اس سے کہا کہ میں نے محمد صلعم سے وعدہ کیا تھا کہ بدر صفری پر اگلے

سال ہماری تمہاری جنگ ہوگی۔ مگر کچھ خشک سالی ہے اور ہم واپس ہونا چاہتے ہیں لیکن

اس طرح یہ خوف ہے کہ مسلمانوں کی جرأت بڑھ جائے گی اور وہ خیال کریں گے کہ ان

لوگوں میں ہمارے مقابلہ کی طاقت نہیں۔ اس لئے تم مدینہ جاؤ اور مسلمانوں کو ڈراو تا کہ

جنگ کے لئے نہ نکلیں اور تمہیں دس اونٹ دونگا۔ چنانچہ نعیم آیا اور اس نے تم کو سامنے

کو تیاری کرتے پایا تو اس نے کہا یہ بات ٹھیک نہیں پچھلے سال انہوں نے تم کو سامنے

قدرت قسان پہنچایا اور اب وہ بہت بڑی تیاری کے ساتھ آ رہے ہیں۔ مگر مسلمانوں نے پروانہ کی اور کہا حسُبَنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ چنانچہ مسلمان بدر صفری پر پہنچ گئے۔ جہاں بنی کنانہ کا تجارتی میلہ لگا کرتا تھا۔ اس میں مسلمانوں نے تجارت کر کے بہت فائدہ اٹھایا اور چونکہ وہاں قریش نہیں آئے اس لئے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ ادھر ابوسفیان واپس مکہ میں پہنچ گیا اور اہل مکہ نے اس مہم کا نام جیش السویق رکھا۔ یعنی صرف ستو پینے کی مہم تھی۔ مسلمانوں میں یہ غزوہ بدر صفری کے نام سے موسوم ہے۔“

(بیان القرآن۔ جلد اول۔ فٹ نوٹ۔ ۵۶۹)

پھر اگلے نوٹ میں لکھا ہے :

”اس آیت میں غزوہ بدر صفری سے لوٹنے کا ذکر ہے۔ اللہ کی نعمت اور فضل میں اُن تجارتی منافع کی طرف اشارہ ہے جو ان کو وہاں حاصل ہوئے۔ اور لم یمسسهم سوءے میں یہ بتایا ہے کہ کسی قسم کی بھی تکلیف ان کو نہ پہنچی۔ کیونکہ کوئی جنگ نہ ہوئی اور اللہ کی رضا کی پیروی یہ تھی کہ باوجود بھاری لشکر کا خوف دلانے جانے کے انہوں نے کچھ پروانہیں کی بلکہ اللہ کی رضا کو اپنے جان و مال پر مقدم کیا۔“

(بیان القرآن۔ جلد اول۔ فٹ نوٹ۔ ۵۷۰)

قرآنی بیان کے اسی پس منظر میں اب مولانا مودودی صاحب کا حاشیہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتے ہیں :

”اُحد سے پلتے ہوئے ابوسفیان مسلمانوں کی چیلنج دے گیا تھا کہ آئندہ سال بدر میں ہمارا تمہارا پھر مقابلہ ہوگا۔ مگر جب وعدے کا وقت قریب آیا تو اسکی ہمت نے جواب دے دیا۔ کیونکہ اس سال مکہ میں قحط تھا۔ لہذا اس نے پہلو بچانے کے لئے یہ تدبیر کی کہ خفیہ طور پر ایک شخص کو بھیجا جس نے مدینہ پہنچر مسلمانوں میں یہ خبریں مشہور کرنی شروع کیں کہ اب کے سال قریش نے بڑی زبردست تیاری کی ہے۔ اور ایسا بھاری لشکر جمع کر رہے ہیں جس کا مقابلہ تمام عرب میں کوئی نہ کر سکے گا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ مسلمان خوفزدہ ہو کر اپنی جگہ رہ جائیں۔ اور مقابلہ پر نہ آنے کی ذمہ داری انہی

پر رہے۔ ابوسفیان کی اس چال کا یہ اثر ہوا کہ جب آنحضرت ﷺ نے بدر کی طرف چلنے کے لئے مسلمانوں سے اپیل کی تو اس کا کوئی ہمت افرا جواب نہ ملا۔ آخر کار اللہ کے رسول نے بھرے مجھ میں اعلان کر دیا کہ اگر کوئی نہ جائے گا تو میں اکیلا جاؤں گا۔ اس پر ۱۵ سو فدا کار آپؐ کے ساتھ چلنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اور آپ انہی کو لے کر بدر تشریف لے گئے۔ ادھر سے ابوسفیان دو ہزار کی جمعیت لے کر چلا مگردو رو زکی مسافت تک جا کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس سال ٹڑنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ آئندہ سال آئیں گے۔ چنانچہ وہ اور اسکے ساتھی واپس ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ آٹھ روز تک بدر کے مقام پر اس کے انتظار میں مقیم رہے۔ اور اس دوران میں آپؐ کے ساتھیوں نے ایک تجارتی قافلہ سے کاروبار کر کے خوب مالی فائدہ اٹھایا۔ پھر جب یہ خبر معلوم ہو گئی کہ کفار واپس چلے گئے تو آپؐ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ (تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ ص ۳۰۵ و ۳۰۶)

خط کشیدہ سے ممتاز عبارت کو بار بار پڑھیں۔ یہ کہاں تک قرآنی الفاظ سے میل کھاتی ہے۔ کیا انسانی حرب و ضرب سے بے خوف اور فقط ایک خدا پر بھروسہ کرنے والے پاکبازوں کی یہی وہ جماعت تھی جس کو خرم موجودات محمد مصطفیٰ ﷺ نے تائید ایزدی سے خصوصی طور تشكیل دیا تھا؟ کیا یہی وہ فرشتہ صفت لوگ تھے جن کے بارے میں آقائے دو جہاں ﷺ نے ساری دنیا کے سامنے فخرًا یہ اعلان کیا تھا اصحابی کا النجوم۔ کیا یہ وہی قدوسیوں کی جماعت تھی جس نے نبی کریم ﷺ کو یک بان ہو کر یہ کہا تھا کہ ہم موسیٰؑ کے ساتھیوں کی طرح نہیں جو یہ کہیں کہ تم اور تمہارا خدا جنگ کے لئے جاؤ ہم یہیں انتظار کریں گے؟ نہیں جہاں آپؐ کا پسینہ گرے گا ہم وہاں اپنا خون بھاولیں گے۔

سورۃ النور کی آیت نمبر ۳ (”اوْ نِسَاءِنَهِنَّ“) کی تشریح

سورہ نور کی اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمان خواتین کو یہ بتایا ہے کہ وہ کن کن افراد کے سامنے اظہار محسن کر سکتی ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں :

”اوْ نِسَاءِنَهِنَّ“

ترجمہ : ”یا اپنی عورتوں کے۔“ (محمد علی لاہوری)
اس آیت کریمہ کے تحت حضرت مولانا محمد علی نے ایک طویل نوٹ لکھا ہے جس میں ”اوْ نِسَاءٍ هُنَّ“ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”اس سے مراد اکثر نے مسلمان عورتیں لی ہیں۔ گویا غیر مذاہب کی عورتوں کے سامنے بھی اظہار حasan نہیں چاہیے۔ مگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مذاہب کی عورتیں نبی صلعم کی بیویوں کے پاس آتی جاتی تھیں (روح المعانی)۔ اور اس لئے امام رازی کہتے ہیں سب عورتیں مراد ہیں۔ میرے نزدیک مطلب یہ ہے کہ اپنی طرز کی عورتیں یا جن سے تعلقات ہوں۔ کیوں کہ بعض رذیل عورتیں یا ناداواقف فتنہ کا موجب ہو جاتی ہیں۔

(بيان القرآن۔ جلد ۲۔ فٹ نوٹ ۲۳۲۳)

اب مولانا مودودی صاحب کا ترجمہ اور تفسیر ملاحظہ فرمائیں :

ترجمہ : ”اپنے میل جوں کی عورتیں۔“

تفسیر : ”اصل میں لفظ استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے ”ان کی عورتیں“۔ اس سے کوئی عورتیں مراد ہیں۔۔۔ اس میں فقہاء اور مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد صرف مسلمان عورتیں ہیں۔ غیر مسلم عورتیں خواہ وہ ذمی ہوں یا کسی اور قسم کی، ان سے مسلمان عورتوں کو اسی طرح پرده کرنا چاہیے جس طرح مردوں سے کیا جاتا ہے۔۔۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد تمام عورتیں ہیں۔ امام رازی کے نزدیک یہی صحیح مذہب ہے۔۔۔ تیسرا رائے یہ ہے اور یہی معقول بھی ہے۔ اور قرآن کے الفاظ سے قریب تر بھی کہ اس سے دراصل ان کے میل جوں کی عورتیں، ان کی جانی بوجھی عورتیں، ان سے تعلقات رکھنے والی اور کام کا ج میں حصہ لینے والی عورتیں مراد ہیں۔ خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ اور مقصود ان عورتوں کو اس دائرے سے خارج کرنا ہے جو یا تو اجنبی ہوں یا ان کے اخلاق و تہذیب کا حال معلوم نہ ہو یا جن

کے ظاہری حالات مشتبہ ہوں اور ان پر اعتماد نہ کیا جاسکے۔“

(تفہیم القرآن۔ جلد ۳۔ سورہ نور۔ فٹ نوٹ ۳۳)

یہاں مولانا مودودی نے حضرت مولا ن محمد علی لاہوری کا نام لئے بغیر ان کی تشریح کو نصرف ”معقول“ کہا ہے۔ بلکہ اس رائے کو ”قرآن کے الفاظ سے قریب تر“ بھی قرار دیا ہے۔

حوالہ کا آدم کی پسلی سے پیدا کیا جانا

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے :

”أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا“ (۲:۱)

”اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔“ (ترجمہ مولانا تھانوی)

تفسیر : ”یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے اول تو حضرت حوا کو ان کی بائیں پسلی سے نکالا۔ پھر ان دونوں سے تمام مرد اور عورتوں کو پیدا کیا اور دنیا میں پھیلایا۔ تو حقیقت میں تمام آدمی ایک جان اور ایک شخص سے اللہ نے پیدا کئے۔“

(گلستان تفاسیر۔ مرتبہ مولوی عبدالقيوم۔ جلد ۲۔ ص ۳)

اب مولا ن محمد علی کا ترجمہ اور تشریح ملاحظہ فرمائیں :

”اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو، جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا۔ اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔“

تفسیر：“الفاظ میں یہ اشارہ سمجھا گیا ہے کہ آدم سے اس کے جوڑے یعنی حوا کو پیدا کیا۔ اور یہ اس طرح ہوا کہ آدم کی ایک پسلی نکال کر اس سے حوابنائی گئی۔ مگر قرآن کریم نے ایسے ہی الفاظ دوسری جگہ استعمال کئے ہیں : وَمِنْ أَيْتَهُ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم آیت ۲۱)۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہارے ہی نفسوں سے تمہارے لئے یہیاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے تسکین قلب حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحم بنایا۔ اور دوسری جگہ ہے : وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا (الخل ۱۶ آیت ۷۲)۔ اب یہاں تمام انسانوں کو یہ کہا ہے کہ تمہاری یہیاں تمہارے نفسوں سے پیدا کیں۔ حالانکہ کہ یہ مراد نہیں کہ تمہاری پسلیوں سے پیدا کیں۔ پس مرد سے عورت کے پیدا کرنے کا منشاء بھی خود قرآن کریم نے بیان فرمادیا ہے۔ یعنی یہ کہ تم ایک دوسرے سے تسکین حاصل کرتے ہو اور تم میں محبت و رحم باہم اس قدر ہے کہ گویا مرد اور عورت دونوں ایک ہی ہیں۔ اس لحاظ سے بھی ایک جگہ مِنْ أَنفُسِكُمْ اور دوسری جگہ مِنْهَا کا استعمال بالکل درست ہے۔ کیوں کہ مرد اور عورت کا اس قدر گہر اتعلق ہے کہ گویا عورت مرد سے ہی بنی ہے یا خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا سے مراد یہ ہے کہ جس ایک جی سے اے مرد و تم کو پیدا کیا اسی سے تمہاری ازواج کو پیدا کیا۔ پس تم مرد اور عورت کے درمیان کوئی اس قسم کا تفرقة نہ کرو کہ ایک کو تو گویا حقوق انسانیت حاصل ہیں اور دوسرے کو نہیں۔ انسان ہونے میں عورتیں تمہارے ساتھ یکسان حقوق رکھتی ہیں، کہ جہاں سے مرد پیدا ہوا وہیں سے عورت پیدا ہوئی۔ ہرگز میں یہ الفاظ عورت کو نہایت ہی عزت کا مقام دیتے ہیں۔ اور یہ جو خیال ہے کہ حدیث سے ہوا کا آدم کی پسلی سے پیدا ہونا ثابت ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ پسلی سے پیدا کرنے کا ذکر پیشک بابل میں پایا جاتا ہے جہاں لکھا ہے : ”آدم پر ایک بھاری نیند بھی

کہ وہ سوگیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بد لے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے، جو اس نے آدم سے نکالی تھی، ایک عورت بنانے کے آدم کے پاس لا یا۔“ (بیدائش ۲۱: ۲۲)۔ مگر کسی حدیث میں یہ نہیں اور جس حدیث سے یہ نکالا جاتا ہے وہ وو طرح پر بخاری میں کتاب النکاح میں آئی ہے ایک جگہ ہے المرأة كالضلع (باب المداراة)۔ عورت پسلی کی طرح ہے۔ اور دوسری جگہ ہے واستوصوا بالنساء خيرا فانهن حُلِقْنَ مِنْ ضِلْعٍ (باب الوسأة بالنساء)۔ عورتوں کے حق میں بھلانی کی نصیحت قبول کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ ان دونوں حدیثوں میں حوا کے حضرت آدم سے پیدا ہونے کا ذکر مطلق نہیں۔ بلکہ عام طور پر تمام عورتوں کا ذکر ہے۔ اصل میں حدیث کی ایک روایت دوسری کی خود تشریح کرتی ہے۔ خلق من ضلع سے کیا مراد ہے۔ المرأة كالضلع نے اس کو صاف کر دیا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ عورتیں پسلی سے تو پیدا نہیں ہوتیں۔ پس مراد وہی ہے جو دوسری حدیث میں بیان کردی کہ وہ پسلی کی طرح ہیں یعنی ان میں اعوجاج (ٹیڑھاپن) ہے۔ ایسی مثالیں خود قرآن شریف میں ہیں حُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الأنبياء آیت ۳۷)۔ مطلب یہ کہ اس میں جلد بازی پائی جاتی ہے۔ اللَّهُ أَكْرَمُ خَلْقَكُمْ مِنْ ضُعْفٍ (الروم آیت ۵۲) یعنی تم میں ضعف پایا جاتا ہے۔۔۔ (بیان القرآن۔ جلد دوم۔ فٹ نوٹ ۵۹۹)

مولانا مودودی کی تشریح سے پہلے ہم مولانا عبدالمadjد ریاضادی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیروں سے ان کی رائے اور تشریحی بیان نقل کر دینا چاہیں گے۔ تاکہ قارئین خود دیکھ لیں کہ ان دونوں مفسروں نے بھی کس حد تک مولانا محمد علی کا اتباع کیا ہے:

مفسر قرآن مولانا عبدالمجاحد ریاضادی

”تحلیق حوا کی تفصیلی کیفیت سے قرآن مجید تو یکسر ساکت ہے۔ رہی حدیث سواس کا بھی یہی حال ہے۔ جس مشہور حدیث کی رو سے حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا

ہونا بیان کیا جاتا ہے اس میں ذکر نہ حضرت آدم علیہ السلام کا ہے اور نہ حضرت حوا کا۔ بلکہ محض عورت کی پیدائش اور کچ شرحت کا بیان ہے۔ آثار میں جو روایت ملتی ہے وہ روایت توریت کی آواز بازگشت ہے۔ اور توریت کا بیان حسب ذیل ہے : ”خداوند خدا نے آدم پر پیاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بد لے گوشت بھر دیا۔ اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک صورت بنا کر آدم کے پاس بھیجا۔“ (پیدائش ۲۲: ۲۳ و ۲۴) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عورت کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے محض بہ طور تشییہ کے ارشاد فرمائی گئی ہوا اور مقصود محض اس کے عدم ثبات کو ظاہر کرنا ہو جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ انسان کی پیدائش جلد بازی سے ہوئی ہے۔ (تفسیر ماجدی۔ مطبوعۃ تعالیٰ کمپنی۔ ص ۲۰)

مفسر قرآن مولانا امین الحسن اصلاحی

”خَلَقَ مِنْهَا زُوْجَهَا“ کے معنی ہیں اسی کی جنس سے۔ اگرچہ اس کے معنی لوگوں نے اور بھی لئے ہیں۔ لیکن جس بنیاد پر لئے ہیں وہ نہایت کمزور ہے۔ ہم نے جو معنی لئے ہیں اس کی تائید خود قرآن میں موجود ہے۔ سورہ خل میں فرمایا ہے وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا (۲۷)۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں۔ اس کے یہ معنی کوئی بھی نہیں لے سکتا کہ یہ بیویاں ہر ایک کے اندر سے پیدا ہوئیں۔“

(تمذیق القرآن۔ جلد دوم۔ ص ۲۳۵ و ۲۳۶)

اب ہم مولانا مودودی کی تفہیم القرآن سے زیر بحث آیت کا ترجمہ اور تشریحی نوٹ پیش کرتے

ہیں :

ترجمہ۔ ”لَوْگُوا! اپنے رب سے ڈر جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنا لیا اور دونوں سے بہت مرد و عورت دُنیا میں پھیلادیے۔“

تشریح : ””اُسی جان سے اس کا جوڑا بنا لیا“، اس کی تفصیلی کیفیت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ عام طور پر جوبات اہل تفسیر بیان کرتے ہیں اور جو بائبل میں بھی بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ آدم کی پسلی سے حوا کو پیدا کیا گیا (تلود میں اور زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت حوا کو حضرت آدم علیہ السلام کی دامیں جانب کی تیرھوں پسلی سے پیدا کیا گیا تھا) لیکن کتاب اللہ اس بارے میں خاموش ہے۔ اور جو حدیث اسکی تائید میں پیش کی جاتی ہے اس کا مغہبوم وہ نہیں جو لوگوں نے سمجھا ہے۔ لہذا ہتریہ ہے کہ بات کو اسی طرح مجمل رہنے دیا جائے جس طرح اللہ نے اس مجمل رکھا ہے۔ اور اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنے میں وقت نہ ضائع کیا جائے۔“

(تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ ص ۳۱۹ تا ۳۲۰)

ایسا لگتا ہے کہ مولانا موصوف خود بھی اس مجمل تشریح سے مطمئن نہیں۔ چنانچہ ”رسائل و مسائل“ (جلد ۵ صفحہ ۳۷) پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

”حضرت ﷺ کے پسلی سے پیدا کئے جانے کا عقیدہ جن احادیث پر مبنی قرار دیا جاتا ہے ان میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ حضرت ﷺ آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کی گئی تھیں۔ بلکہ ان میں سے ایک کے الفاظ یہ ہیں کہ عورتیں پسلی سے پیدا ہوئی ہیں (استوصواب النساء خیرا فانهن حُلِقْنَ مِنْ ضَلْعٍ)، عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے (المراة

کالصلع) اور تیسری میں یہ فرمایا گیا ہے کہ عورت ذات پسلی سے پیدا ہوئی ہے (المراة خلقت من ضلع) مزید برائے ان سب حدیثوں میں اصل موضوع بحث انسانی تخلیق کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ حضور نے یہ بات اس غرض کے لئے بیان فرمائی ہے کہ عورت کے مزاج میں پسلی کی سی بھی ہے اس کو سیدھا کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس کی اس فطری بھی کو ملاحظہ کر کر ہی اس سے برداشت کرنا چاہیے۔“ (ترجمان القرآن - مجید ۱۹۶۶ء)

ایران کے مشہور شیعہ عالم و مفسر قرآن

جناب زین العابدین رہنما

محترم زین العابدین رہنما کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ دُنیا نے اسلام میں اُن کو خاصی قدر و منزلت حاصل ہے۔ اُن کی فارسی ”سیرت نبوی“ کافی مقبول ہے۔ متعدد زبانوں میں منتقل ہو چکی ہے، ایک ترجمہ کشمیری زبان میں بھی چھپا ہے۔ اُن کی تین جلدیوں پر مشتمل فارسی تفسیر القرآن بھی مشہور ہے۔ اپنے ظاہری حسن و اشائیں، ترجمہ و تفسیر اور ترتیب و تدوین میں اپنے پیشو و حضرت مولانا محمد علیؒ کے انگریزی ترجمہ قرآن کے بالکل ہم آہنگ ہے۔ اس تفسیر کی ایک نمایاں اور قابل ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ مصنف نے لومہ الایم سے بالکل بے بیاز ہو کر ان تمام مقامات کی باقاعدہ نام لیکر نشاندہی کر دی ہے۔ جن کو براہ راست حضرت مولانا محمد علیؒ کی ما یہ افتخار انگریزی تفسیر سے اخذ کیا گیا ہے۔ دیگر تفسیری حواشی میں بھی مولانا محمد علیؒ کے علم الکلام کی جھلک صاف و کھلائی دیتی ہے، یہی حال ترجمہ کا ہے۔

حضرت مولانا محمد علیؒ نے سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت (الْحَمْدُ لِلّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ) کا ترجمہ یہ کیا

ہے: "Praise be to Allah, the lord of the worlds"

محترم زین العابدین نے بالکل اسی جملے کو فارسی زبان میں پیش کیا ہے:

”ستالیش خدائی را کہ پور دگار جہانیاں است“

لفظ عالَمِينَ کی تشریح کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے لکھا ہے:-

"The word translated as 'WORLDS' is 'aalameen', which is plural of 'aalam' (from root 'ilm, to know), indicating literally *that by means of which one knows a thing*, and hence it signifies 'world' or 'creation', because by it the creator is known."

ترجمہ : "قرآنی متن میں "جہانوں" کے لئے "عالَمِینَ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو عالَمُ کی جمع ہے۔ عالَمُ، عِلْمٌ (یعنی جانتا) سے مشتق ہے۔ یعنی وہ ذریعہ جس سے کوئی شے جانی جاسکے۔ مطلب یہ کہ عالَمِینَ کا عِلْمٌ ہی ہمیں حقیقی خالق سے روشناس کراتا ہے۔"

بالکل یہی بات محترم زین العابدین کے حاشیہ میں موجود ہے:
 "کلمہ عالَمِینَ جمع کلمہ عالَمُ است۔ یعنی کیجان، ریشمہ این کلمہ، علم است کہ وسیلہ شناخت۔ کائنات و جہان آفرینش است۔"

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

"ان لوگوں کے راستے (پر) جن پر تو نے انعام کیا۔" (محمد علی)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا محمد علی لکھتے ہیں:

"Those upon whom favours are bestowed are according to Ibn Abbas *the four classes mentioned in 4:69*, viz. The prophets, the truthful, the faithful and the righteous (*Bahr al Muheet*). It is in the footsteps of these spiritual leaders of the world that the Muslims aspire to walk.....According to the Holy Qur'an the favours which were bestowed upon the prophets----The gift of Divine revelation being one of them---- can still be bestowed upon the righteous who follow the right way. It should, however, be borne in mind that prophethood and revelation are two different things, because the gift of revelation was, according to the express teachings of

the Holy Qur'an, granted to others than prophets as well; as, for instance to the mother of Moses (20:38) and to the disciples for Jesus Christ (5:111). This gift of revelation or being spoken to by God, according to most authentic *Hadis*, will be granted to the righteous among Holy Prophet's followers---- "There will be among them men to whom God will speak though they would not be prophets? (Bukhari 62:6)." (The Holy Qur'an, Page 5)

ترجمہ : ”حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق یہ منعم علیہم پاکبازوں کے وہی چار گروہ ہیں جن کا ذکر (4:69) میں ہے۔ یعنی انبیاء، صدیق، شہید اور صالح (بigrحیط)۔ گویا سارے مسلمان دُنیا جہاں کے انہیں روحانی پیشواؤں کے نقش قدم پر چلانا چاہتے ہیں۔ جو انعامات انبیاء کو عطا کئے گئے، ان میں ایک انعام ”وَجِيْهَةُ الْهَامِ“ بھی ہے۔ اور از روئے قرآن یہ نعمت آج بھی بزرگانِ الٰہی کو عطا کی جاتی ہے۔ یاد رہے کہ نبوت اور وحی والہام و مختلف چیزیں ہیں۔ کیونکہ قرآن پاک کی واضح ترین تعلیمات کے مطابق یہ نعمت غیر نبیوں پر بھی اُتاری گئی۔ مثال کے طور پر (20:38) جہاں یہ نعمت حضرت موسیؑ کی والدہ کو عطا گئی اور (5:111) جہاں یہ نعمت حضرت عیسیؑ کے حواریوں پر اُتاری گئی (حالانکہ وہ نبی نہ تھے)۔ وحی والہام یا مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ وہ انعام ہے، جو اب بھی حضرت نبی کریمؐ کے برگزیدہ تبعین کو عطا کیا جاتا ہے، یہ مژده حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح ترین حدیث میں بھی سنایا گیا ہے۔ فرمایا : أُمَّتٌ مُّهَمَّةٌ يَعْلَمُهُ مِنْ أَيْمَانِهِ بھی لوگ ہوں گے۔ جن کے ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمکاری کرے گا، حالانکہ وہ نبی نہ ہوں گے۔ (بخاری شریف، 6:62)۔“

اسی حاشیے کو انحصر کے ساتھ فارسی زبان میں منتقل کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:
 فٹ نوٹ نمبر 7، آنہا کہ نعمت خداوند شامل حالتان شدہ چہار طبقہ اند: پیامبران، راستگویان، شہیدان و نیکوکاران۔ مسلمان با یاد از رفتار این چہار طبقہ پیروی کنندتا مشمول نعمت ہائی الٰہی بشوند و تقصود شان تہان نباید، بعد کمال رسیدن خودشان باشد بلکہ براہ راست ہدایت کردن دیگران ہم بہمان درجہ از اہمیت است۔ طبق آیہ ہائی قرآن کی از نعمت

بای الہی نعمت وحی والہام است و این امر اختصاص بے پیامبر ان ندارد، پیغمبری وحی دوچیز مختلف است به پارسایان و یکوکاران هم ممکن است وحی نازل شود، چنانچه تصریح قرآن است که به مادر موسی وحی نازل شد: ”گفت اے موسی درخواست تو پذیرفته شد و بار دیگر بر تو منت نهادیم که به مادرت آنچه باید وحی کردیم“، (قَدْ أُرْيَتْ سُوْلِكَ يَا مُوسَى ، وَلَقَدْ مَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً، إِذَاً أُرْحِنَا إِلَيْكَ مَا يُؤْخَذُ) (سوره نبر 20 آیت 38)۔ یادوی والہام کہ بے حواریون مسح نازل شد، ”بے حواریون وحی کردم کہ بمن و به پیامبر ایمان آورند گفتند کہ ما ایمان آوردیم و تو گواہ باش کہ ما ز جملہ پیروان و فرمانبر دگانیم“، (وَإِذَاً أُرْحِنَتِ إِلَيْكَ الْحَوَارِينَ أَنْ أَمْنُوا بِي وَبِرَسُولِي قَالُوا أَمْنَا وَأَشْهَدْ بِإِيمَانِنَا مُسْلِمُونَ) (سوره نبر 5، آیت 111)۔ (فارسی ترجمہ تفسیر ص 88)

سورہ البقرہ کی دوسری آیت کے حاشیے میں لفظ ”متقی“ کی بحث کے دوران محترم زین العابدین لکھتے ہیں:

”.....ولی پیشتر مترجمان متقدی را بمعنى پر هیزگار و دیندار و بینانک از خدا ترجمه کرده اند. و سید محمد علی در ترجمه قرآن پر انگلیسی متقدی را بکمی که وظایف خود را انجام میدهد ترجمه کرده است.“ (فارسی ترجمه قرآن - صفحه ۱۰۷- فٹ نوٹ ۹)

ترجمہ: ”اکثر مترجمین نے ”متفقی“ کے معنی پر ہیزگار، دیندار اور خدا سے ڈرنے والا کہے ہیں۔ جبکہ مولانا محمد علی نے اپنے انگریزی ترجمۃ القرآن میں ”متفقی“ کے یہ معنی لکھے ہیں۔ ”متفقی وہ ہے جو اپنے وظائف اور ذمہ داریوں (حقوق اللہ اور حقوق الناس) کو کما حقہ ادا کرے۔“

بالکل یہی بات مولانا میں احسن اصلاحی نے ایک جگہ ”تدریس القرآن“ میں کہی ہے :
 ”انہی آنحضرت جم کاشش علیہ کا اصطلاح ۲۷ میں تلقی کی سر تعمیہ کر تھا۔

(ت) (آلة آرسن) حمل

(مدبر افغان - جلد ۸ - ص ۱۲۸)

محترم زین العابدین کے فارسی ترجمہ قرآن میں جگہ جگہ حضرت مولانا محمد علی کے انگریزی ترجمۃ القرآن کا مکمل حوالہ موجود ہے۔ اپنی نگاہ دامانی کے پیش نظر ہم یہاں صرف دو اور حوالے نقش

کریں گے۔

”بَايْنَكُمْ يَهُودٌ يَا مُسْجِيَّاً هُرْدَوْبَيْتُ الْمَقْدِسُ رَامِرْكُزْ عِبَادَتُ خُودْ قَرَارِدَادَه بُونَدَوْلِي یَهُجَّ
كَدَام آزْرَاقْلَه خُودَنَمِيدَ اَسْتَندَ مُسْجِيَّاً بُسوِيْ مِشْرَقَ مِيَايَسْتَادَنَدَوْهَمْ چِنْيَنَ مِيَانَ یَهُودَيَاَنَ
وَسَامِرِيَاَنَ اَخْتِلَافَ بُودَه۔ اَكْرَچَه هَرْدَوَيِ آنَهَا اَزَپِيرَوَانَ مُوسَيِ بُونَدَه۔ (تَفْسِير سَيِّدِ مُحَمَّدِ عَلِيِّ)
(فارسی ترجمہ القرآن۔ فٹ نوٹ 121 ص 163)

یہ حاشیہ حضرت مولانا محمد علی کے انگریزی ترجمۃ القرآن کے فٹ نوٹ نمبر 189 سے مਾخذ ہے۔
حضرت مولانا کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"Notwithstanding that jews and Christians both looked to the temple at Jerusalem as their central temple, they were not agreed upon it as their 'Qiblah' or spiritual centre. The Christians turned toward, east (Muir). Moreover, there are differences among the jews and the Samaritans, though both follow the Law of Moses."

(The Holy Qur'an, P.62.)

ترجمہ: ”بَاوِجُودِ اس بات کے کہ یہود و نصاریٰ دونوں ہی بیت المقدس کو اپنی مرکزی
عِبَادَتِگَاهَ سَجَدَتَه تھے۔ لیکن اس بات پر متفق نہ تھے کہ بیت المقدس دونوں کا یکساں قبلہ
ہے۔ مُسْكِنی لوگ مشرق کی طرف منہ کرتے تھے (میور)۔ علاوہ ازیں یہودیوں
اور سامریوں کے ماہین بھی اختلافات پائے جاتے ہیں حالانکہ دونوں ہی حضرت موسیٰ
علیہ السلام کے پیر و کار ہیں۔“

مِنْ أَجْلِ ذَلِكَ كَتَبْنَا عَلَى بَنَى إِسْرَاءِيلَ أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا مَبْغُصًا نَفْسًا فَأُوْ
فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَانَمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا طَوْمَنْ أَحْيَاهَا فَكَانَمَا أَحْيَا
النَّاسَ جَمِيعًا طَوْلَقَدْ جَاءَتُهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ إِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ بَعْدَ
ذَلِكَ فِي الْأَرْضِ لَمُسْرِفُونَ۔ (المائدہ 5. آیت 32)

ترجمہ: ”اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کے لئے یہ مقرر کر دیا کہ جو کوئی کسی جان کو بغیر
جان کے (بدلہ کے) یا زمین میں فساد کے، مارڈا لے تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار

ڈالا۔ اور جو کوئی اس کو زندہ رکھے تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ رکھا اور یقیناً ہمارے رسول ان کے پاس کھلی دلائل لیکر آئے پھر اس کے بعد بھی ان میں سے بہت سے یقیناً زمین میں حد سے نکلنے والے ہیں۔“ (ترجمہ محمد علی)

اس آیت پر جو حاشیہ انگریزی ترجمۃ القرآن میں لکھا ہے وہ یوں ہے:-

"The reference is generally understood to be to the gravity of the crime of murder, requiring the execution of the criminal. But by the killing of a person may as well be meant the killing of the Prophet, who had come to establish righteousness. The killing of that great teacher of righteousness was indeed equivalent to the killing of all men and the saving of the life of that great saviour of humanity was equivalent to saving humanity itself. The reference is to the Jewish plots against the life of the Holy Prophet, and that is the reason for mentioning here the Israelites in particular."

(The Holy Qur'an. F.N. 689, P.250)

ترجمہ "اس آیت کو قتل کے جرم سے متعلق مانا گیا ہے۔ کیونکہ یہ جرم اتنا نگین ہے جس کی سزا موٹ ہے۔ پر لفظ "نفس" نکرہ (جان) بخلاف عظمت نبی پر بھی بولا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہی عظیم الشان نفس قدسی نبکی کا معلم اور مصلح ہوتا ہے جو لوگوں میں نبکی اور تقویٰ پھیلاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس اکیدے کا قتل گویا پوری انسانیت کا قتل ہوتا ہے۔ اور بچایا جانا انسانیت کو زندہ رکھنا ہے۔ یہاں اشارہ یہود یوں کے اس منصوبہ قتل کی طرف ہے، جو وہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بنار ہے تھے۔ اسی لئے نبی اسرائیل کے ذکر کو خاص طور پر لایا گیا ہے۔"

یہی نوٹ محترم زین العابدین نے اپنے فارسی ترجمہ قرآن میں پورے حوالے کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

"از این آیا ہمیت قتل نفس و نژوم جزای بکشل مستقادی شود۔ اما خن از قتل نفس، باز ہم ممکن است بالتجهیز تو طبعہ قتل پیامبر باشد۔ زیرا او نیز برای راستی و پارسای ظہور کردہ بود۔ و کشتن اور حکم نابود شدن پارسای و تقویٰ، وسلامت وی بمحاذہ نجات انسانیت بود و یاد کردن از

قوم بني اسرائيل نيز نشان می دهد کہ روی خن با یہودانی است کہ قصد قتل پیامبر را
داشتند۔ (تفسیر سید محمد علی پاکستانی)“

(فارسی ترجمۃ القرآن - ص 466 - فٹ نوٹ - 472)

مفسرین کرام پر حضرت مولانا محمد علیؒ صاحب کا اثر

1969ء میں محترم بیشراحمد سوزا ایم۔ اے (عربی) کو ایم اے کے لئے پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے ایک تحقیقی مقالہ دیا گیا۔ جس کا عنوان تھا: ”حضرت مولانا محمد علی لاہوری بحثیت مفسر، یہ تحقیقی مقالہ منظور (accept)“ بھی کیا گیا۔ محترم سوزا صاحب نے 1970ء میں اس کے چند اوراق احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے موقر جریدے ”روح اسلام“ میں شائع فرمائے تھے۔ یہ تحقیقی مواد یقیناً اس قابل ہے کہ اسے من و عن معزز قارئین کی نذر کیا جائے۔

پہلا اثر

جب تفسیر قرآن پر کتابیں لکھی گئیں۔ تو ان کا انداز یہ تھا کہ قریب قریب ہر آیت کے متعلق یہ کہا گیا کہ اس کا ”شان نزول“ یہ ہے۔ یعنی فلاں واقعہ یوں ہوا اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس طرح قرآن کریم کی آیات کا مفہوم ان کے الفاظ کی رو سے نہیں بلکہ ان واقعات کی روشنی میں متعین کیا گیا۔ جن کے متعلق سمجھا گیا کہ وہ ان کے نزول کا سبب تھے۔ پھر اسی مفہوم کے مطابق قرآنی الفاظ کے معنی متعین کئے گئے۔ جن سے قرآن کریم کا صحیح صحیح مطلب بیان نہیں ہو سکتا۔ یہ بات ایک مثال کے ذریعہ سمجھ میں آجائے گی۔

سورة النساء کی آیت الرجال قوامون علی النساء کا ترجمہ یہ کیا گیا:-

- مرد حاکم ہیں اور عورتوں کے (ترجمہ شاہ رفیع الدین)
- مرد سلطراں کھنے والے ہیں عورتوں پر (ترجمہ سید احمد خان صاحب)
- یہاں قوامون کا ترجمہ ”حاکم یا سلطراں کھنے والے“ کیا گیا ہے حالانکہ لغت کی رو سے اس کے معنی کچھ اور ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے:-

”حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (اس کا) مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہؐ کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے مجھے تھپٹ مارا ہے اس پر آپؐ نے بدله لینے کا حکم دیا ہی تھا جو یہ آیت اتری اور بدله نہ دلوایا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاری اپنی بیوی صاحبہ کو لئے ہوئے حاضر خدمت ہوئے اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہؐ میرے خاوند نے مجھے تھپٹ مارا ہے جس کا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے، آپؐ نے فرمایا کہ اسے (اس کا) حق نہ تھا۔ وہیں یہ آیت اتری کہ ادب سلکھانے کے لئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اور چاہا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اور چاہا تھا..... ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ مساوی اللہ تعالیٰ کے دوسرا کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔“

(تفسیر ابن کثیر۔ امیر جم مولوی محمد جو ناگری)

ان تفسیری روایات کی رو سے مرد کی پوزیشن حاکم قرار پائی۔ کشاف میں قوامون کا مطلب مسیطرين یعنی داروغے اور تفسیر جلالین میں متسلطین یعنی عورتوں پر غلبہ و سلط رکھنے والے۔ اس لفظ کا یہی مفہوم کتب لغت میں بھی آگیا اور اسی سے ہمارے ہاں اس کا ترجمہ حاکم اور سلطراں کھنے والے ہو گیا۔

تفسیری روایات کی وجہ سے قرآنی الفاظ کے مطالب و معانی جو کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ہم نے مثال کے طور پر ایک آیت پیش کی ہے۔ ایسے تفسیری روایات پر منی الفاظ کے معانی

ومطالب سے متقدّمین کی تفاسیر بھرپڑی ہیں جن سے قرآنی آیات والفاظ کا مفہوم اپنی اصل سے ہٹ چکا ہے۔

مولانا محمد علی صاحب^ر نے قرآنی الفاظ و آیات کے بارے میں روایات پر منی الفاظ کے معنی و مطالب پر انحصار نہیں کیا۔ بلکہ بقول ان کے ”استعمال الفاظ کے متعلق لغت کو سب سے مقدم کیا ہے۔ جن معنوں کی اجازت لغاتِ عربی نہیں دی ان معنوں کو قبول نہیں کیا“، اور یہ کہ ”قرآن کریم میں الفاظ کے استعمال میں وسعت لغوی موجود ہے اور ایک جگہ ایک لفظ ایک معنی میں استعمال ہوا ہے تو دوسری جگہ کسی اور معنی میں استعمال ہو گیا اور یہ صرف سیاق سے ہی فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کون سے معنی کس جگہ مراد ہیں۔“

چنانچہ وہ ”الرجال قوامون علی النساء“ پر لغوی بحث کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:-

”قوامون. قوام کی جمع ہے جو قیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ قام الرجال علی المرأة کے معنی ہیں مانہا یعنی اس کی مؤنث یا روزی مہیا کی۔ اور قوام علیها کے معنی ہیں مائئنٰ لہا۔ یعنی اس کی روزی مہیا کرنے والا۔ اور الرجال قوامون علی النساء کے معنی ہیں۔ متسکفلون بامور النساء مَعْنِيُونَ بشؤنهن۔ یعنی عورتوں کے امور کے متنافل ان کے حالات پر توجہ کرنے والے (السان العرب)۔ اور تاج العروس میں ہے کہ قام الرجل المرأة اور قام علیها کے معنی ہیں مانہا و قام بسانہا متنافل بلا بامرہا۔ یعنی اس کی مؤنث یا روزی مہیا کرنے والا اور اس کے امر کا متنافل۔ پس قوام کے اصل معنی متنافل ہیں اس کے معنی محض محافظ یا محض حاکم درست نہیں اور تنافل میں روزی مہیا کرنا حفاظت کرنا اور تادیب سب امور شامل ہیں کیونکہ جو شخص جس کا متنافل ہوتا ہے۔ اس کی جسمانی اور اخلاقی حفاظت بھی اس کے ذمہ ہوتی ہے۔“ (بیان القرآن ص ۵۰۰)

مولیانا صاحب^ر نے ترجمہ کیا ہے:-

”مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں“

الفاظ و آیات اور اصطلاحات قرآنی کی توضیح و تشریح کے سلسلہ میں مولانا نے اپنی ساری تفسیر قرآن میں یہی طریق اختیار کیا ہے اور ہر ممکن یہ کوشش کی ہے کہ قرآنی الفاظ کا وہ مفہوم معین کیا جاسکے جو ان سے نزول قرآن کے زمانہ میں سمجھا جاتا تھا۔ بعد کے مفسرین نے مولانا کے اس اصول کو بڑی شدت سے اپنایا ہے۔ بعض مفسرین کے تراجم ملاحظہ ہوں:-

—**قوامون** ”کے معنی ہیں روزی مہیا کرنے والے“ جس کا مطلب یہ ہے کہ تقسیم عمل کی رو سے مردوں کا فریضہ کسب معاش ہے۔“

(لغات القرآن - ص ۹، از غلام احمد پرویز صاحب)

”مرد عورتوں کی زندگی کے بندوبست کرنے والے ہیں“۔ ”مرد عورتوں پر قوام ہیں“۔ (تفسیر القرآن از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

— ”مرد عورتوں کے سردهرے ہیں“۔ (مولانا عبدالمajid Dr. Yabadi)

چنانچہ مولانا صاحب نے قرآن کے معانی متعین کرنے کا جو طریق اختیار کیا اور جسے اپنے اردو ترجمہ تفسیر بیان القرآن میں بیان کیا ہے۔ وہ طریق ما بعد کے مفسرین نے اختیار کیا۔

غلام احمد پرویز صاحب قرآن کریم کے معنی متعین کرنے کا طریق یوں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ متعلقہ لفظ کے مادہ کے بنیادی مفہوم اور اس کی خصوصیت کو دیکھا جائے۔

۲۔

صرخ انسینوں کے ہاں اس لفظ کا استعمال کس طرح ہوتا تھا۔

۳۔ قرآن کریم میں وہ لفظ کس مقام پر آیا ہے اور اس نے کس رنگ میں استعمال کیا ہے۔

(ملخص عبارت لغات القرآن جلد اول صفحہ ۷۱)

چنانچہ بعد کے مفسرین نے خلاف روایت الفاظ و اصطلاحات قرآنی کے معنی و مطالب کی

جائج پھٹک کے لئے بڑی تحقیق سے کام لیا ہے۔

دوسری اثر:

عام طور پر یہ مان رکھا تھا کہ قرآن کریم کے اندر بعض آیات ایسی موجود ہیں جن کو دوسرا آیات نے منسوخ کر دیا ہے اور پھر اس بات پر اس قدر اصرار تھا کہ جو شخص اسے نہ مانے اسے

مسلمان نہ سمجھا جاتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ایک آیت دوسری سے منسون تب ہو گی جب وہ ایک دوسرے کے خلاف ہو گی۔ اور دونوں میں اس قدر اختلاف ہو گا کہ اگر ایک بات صحیح ہے تو دوسری غلط ہے۔ ناسخ و منسون کو مان کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ قرآن کریم میں اختلاف موجود ہے۔ حالانکہ خود قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجِدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا۔ (النساء: ۸۲) اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا یعنی انسان کا بنا یا ہوا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف ہوتا۔ پس قرآن کریم میں اختلاف ماننا اس کو مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ ماننے کے مراد ہے۔ دیکھنے ناسخ و منسون ماننے کی زدہ ماں تک پڑتی ہے۔

عام طور پر ناسخ و منسون کا نظریہ متداول تھا اور مفسرین اسے مانتے چل آ رہے تھے۔ مولانا نے اس نظریہ کے خلاف آواز اٹھائی اور بتایا کہ قرآن کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں جو دوسری سے منسون ہو اور نہ قرآن شریف میں کہیں یہ ذکر ہے کہ اس کی بعض آیات دوسری کو منسون کرتی ہیں، جن آیات سے یہ مطلب نکالا جاتا ہے ان کا منشاء صرف پہلی شرائع کے بعض احکام کی تنتیخ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی عظمت کو مولانا نے ظاہر کیا اور بعد کے مفسرین نے اس سلسلہ میں مولانا کا تتبع کیا ہے۔ آج کل اس مسئلہ پر تین مبسوط کتب مختلف مؤلفین کی دستیاب ہیں جن میں اس نظریہ ناسخ و منسون کو غلط فرار دیا گیا ہے۔^(۱)

غلام احمد پرویز اصول حل لغات کے سلسلہ میں من جملہ اور اصولوں کے ایک یہ اصول بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ:

”قرآن کریم کی پوری تعلیم کا مجموعی تصور سامنے ہونا چاہئے اور اس بنیادی اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس کے مفردات اور اصطلاحات کا مفہوم اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جائے۔ اس لئے کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔“

(لغات القرآن پیش لفظ ۷۱)

(۱) ہمارے قدامت پندرہ یوینڈی حضرات بھی ایک چھوٹی سی کتاب ہاں ”قرآن حکم۔ جس کی کوئی آیت منسون نہیں“ شائع کر چکے ہیں۔ جس کا پیش لفظ مولانا قاری طیب صاحب نے لکھا ہے۔ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہی وہ کتاب ہے جس میں ناسخ منسون کے غیر اسلامی عقیدہ کو پہلی بارہ بارہ کیا گیا ہے۔ خاکسار نے قاری صاحب محترم کو اس غلط بیانی کی طرف تو جبکہ دلائی تھی، لیکن انہوں نے میرے رجمروڑ مکتب کا کوئی جواب نہ دیا۔ محترم رحمت اللہ طارق نے ۱۹۷۴ء میں ایک نہایت ضمیم کتاب ”تفیر منسون القرآن“ شائع فرمائی، جو اس موضوع پر حرف آخر کھلانے کی حقدار ہے۔ (خورشید)

(۱) مولانا عبد اللہ سندھی کی ”ملفوظات“ میں ان کا یہ بیان بھی چھپا ہے:-
”میں عکیم نور الدین صاحب سے قادیان میں متعدد بار ملا۔ واقعی وہ بہت بڑے عالم قرآن تھے۔ میں تم سے کہوں، ہندوستان سے باہر میں کئی اسلامی ملکوں میں رہ چکا ہوں۔ اور یہاں کم معمولی میں مختلف ملکوں سے بڑے بڑے مسلمان علماء آتے رہتے ہیں۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے آج تک علم قرآن کا اتنا بڑا عالم نہیں دیکھا جتنے تکیم نور الدین تھے۔“ (آفادات و ملفوظات حضرت مولانا عبد اللہ سندھی)
مرتبہ پروفیسر محمد سرور۔ 34، ناشر سندھ سارا کادی لاہور۔ (خورشید)

مولانا کے اس نظریہ کا اثر پس رو مفسرین پر نمایاں ہے۔

تیسرا اثر

مولانا نے قرآن شریف کی تفسیر کو اور اس کے ساتھ ہی گویا مذہب کو ایک علمی رنگ دیا ہے ایک زمانہ امت مسلمہ پر ایسا بھی آیا تھا کہ قرآن کریم کے معمولی واقعات کے ذکر پر خلاف عقل علم قصوں کہانیوں کا رنگ چڑھا دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نئی نسل جو سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی تھی ان قصوں کو قرآن شریف کا حصہ سمجھ کر خود اس پر حکمت کتاب سے تنفس ہو گئی۔ اور مذہب کو قصوں کہانیوں کا مجموعہ سمجھنے لگی۔ علماء نے بجائے اس کے کران شہہرات پر ان کی تشفی کرتے ہر اس شخص پر کفر کے فتوے لگانے شروع کر دیئے جو دین کے اصول نہیں بلکہ ادنیٰ جزویات میں اختلاف کا نام لے یا جو تفاسیر کے قصوں کہانیوں کو اللہ کا کلام سمجھ کر ان پر ایمان نہ لائے یا جو اعتراض اس کے دل میں پیدا ہواں کو بیان کرے۔ مولانا نے عین اس وقت اسلام اور خود مذہب کی یہ خدمت کی کہ کفر کے فتوؤں کی پرواہ نہ کرنے ہوئے اس طرزِ عمل کے خلاف جہاد کیا۔ اور یہ بتایا کہ قرآن کریم خلاف عقل فہم اور علم و حقیقت قصوں اور کہانیوں سے پاک ہے اور نہ یہ کہ اس کے اندر کوئی ایسے امور نہیں جو سائنس یا عقل کے خلاف ہوں۔ بلکہ یہ بھی دکھایا کہ اس نے آج سے تیرہ چودہ سو سال پہلے ایسے ایسے علمی امور کا اکشاف کیا جن کو علمی دنیا نے آج دریافت کیا ہے۔ اصول تفسیر کی اس نئی روشنی سے آنے والے مفسرین نے فائدہ اٹھایا ہے۔ موجودہ تفاسیر کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسرائیلیات اور قصص نصاریٰ سے اور روایات سے شمار سے آزاد ہیں۔ (۱)

چوتھا اثر

حضرت مولانا محمد علی صاحب[ؒ] ”بیان القرآن“ کی تمهید میں لکھتے ہیں:

”میرا منشاء یہ بھی ہے کہ مسلمانوں پر قرآن کریم کے درس و تدریس کا سلسلہ

(۱) اس سقتم کو دیوبند کے فدامت پند حضرات نے بھی پہچان لیا ہے، چنانچہ دیوبند والوں نے ایک کتاب ”تفسیروں میں اسرائیلی روایات“ کے نام سے شائع کر دی ہے۔ پاکستان کے مشہور عالم دین علام حافظ قاری حبیب الرحمن صدیقی کا نہلوی نے اپنے طویل تحقیق و مطالعہ کو ”مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت“ (قرآن و حدیث، تاریخ و فن رجال کی روشنی میں) کے نام سے چار جلدیوں میں بھی کر دیا ہے۔ جلد اول کا یہ اقتباس قابل دیدہ ہے:

”لیکن آج کے دور میں ہمارے علماء اپنی کم علمی کے باعث حدیث، فقہ، تفسیر اور دیگر مضمایں کی تمام روایات پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آتے ہیں۔ اور جو شخص بھی کسی روایت پر فن جرح و تقدیل اسماء الرجال، علم الروایہ اور علم الدرایہ کے ذریعہ بحث کرتا ہے۔ وہ یا تو مکمر حدیث قرار دیا جاتا ہے یا خارجی، حالانکہ یہ تمام فتوں محدثین کرام نے اسی لئے وضع کئے تھے۔ کروایات کو تقیدی کی کسوٹی پر پرکشہ رہو اور صدیوں اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اور دیگر ممالک اسلامیہ میں آج بھی اس پر عمل ہوتا ہے۔ لیکن ہندو پاکستان میں یہ ایک زبردست جرم بن چکا ہے۔“ (مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت۔ جلد اول۔ ص 412-419ء) (خوشید)

عام طور پر جاری ہو۔“

جب مولانا نے تفسیر لکھنے کا آغاز کیا اس وقت مسلمانوں میں قرآن کریم کے درس و مدرسیں کا سلسلہ جاری نہ تھا۔ اس کا آغاز مولانا کی اس تحریک اور اس تعامل سے ہوا۔ مولانا صاحب نے نہ صرف اس خواہش کا اظہار کیا بلکہ اس کا آغاز بھی کیا۔ آپ کے جاری کردہ درس قرآن میں بڑے بڑے اہل علم مسلمان اور زعماء شامل ہوتے تھے۔
مولانا کی اس تڑپ اور تحریک کا یہ نتیجہ تکلا کہ مفسرین مساجد اور دوسرے مقامات پر قرآن کریم کے درس دیتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ روزانہ اور ہفتہوار اور ماہوار جاری ہے۔ یہ امر کہ اس کا آغاز مولانا نے ہی کیا اخبار ”نوابے وقت“ لاہور میں جناب غلام مرشد صاحب کا ایک انشرو یوشائیع ہوا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ قرآن کریم کے درس و مدرسیں کا آغاز احمدیوں نے ہی کیا ہے۔

پانچواں اثر

مولانا عبد اللہ صاحب سندھی^(۱) نے ممالک اسلامیہ اور شرق و غرب کے علاقوں کا دورہ کیا ہے وہ اپنے دورہ کے تاثرات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں جہاں کہیں گیا ہوں وہاں حکیم مولوی نور الدین صاحب کے انداز تفسیر کا ہی رجحان پایا جاتا ہے (۱)۔ مولانا کا یہ مشاہدہ مولانا محمد علی صاحب کی تفسیر کی اثر پذیری کا ترجuman ہے کیونکہ مولانا محمد علی نے ترجمہ تفسیر میں حضرت حکیم مولوی نور الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انداز تفسیر و افکار و نظریات کو پیش کیا ہے۔ مولانا خود فرماتے ہیں:-

”اس ترجمہ کے اہم مطالب ایک ایسے شخص (حضرت حکیم مولانا نور الدین صاحب) کے ہیں جس نے اپنی ساری عمر بچپن کے زمانے سے لے کر اسی سال تک

(۱) مولانا عبد اللہ سندھی کی ”ملفوظات“ میں ان کا یہ بیان بھی چھپا ہے:-

”میں حکیم نور الدین صاحب سے قادیانی میں متعدد بار ملا۔ واقعی وہ بہت بڑے عالم قرآن تھے۔ میں تم سے کہوں، ہندوستان سے باہر میں کئی اسلامی ملکوں میں رہ چکا ہوں۔ اور بیہاں کہ معظمہ میں مختلف ملکوں سے بڑے بڑے مسلمان علماء آتے رہتے ہیں۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے آج تک علوم قرآن کا اتنا بڑا عالم نہیں دیکھا جتنے حکیم نور الدین تھے۔“ (آفادات و ملفوظات حضرت مولانا عبد اللہ سندھی۔ مرتبہ پروفیسر محمد سرور۔ ص 34)۔ (خوشید)

صرف قرآن کریم کے مطالعہ اور خدمت میں صرف کی ہے اور ہزار ہاکتا میں صرف اس نیت سے پڑھیں کہ کسی آیت کے حل کرنے میں مدد ملے۔“ (مجاہد کبیر، ص 8)

اور مولانا نور الدین صاحب گاندراز تفسیر کیا ہے۔ حکیم صاحب خود ہی فرماتے ہیں:-

”میں نے اپنی زندگی کو بچپن سے لے کر بڑھا پتک قرآن کریم کے مطالعہ میں اور اس پر تدبیر میں گذارا ہے اور جس طرح پر اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا پاک کلام سمجھایا ہے، بہت کم لوگوں نے سمجھا ہو گا میرے مذکور ہمیشہ سادگی اور کہانیوں سے دور رہنا اور قرآن کے ظاہر کا اتباع رہا ہے، اسی کے مطابق میں نے بھی ہمیشہ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔“ (مجاہد کبیر، ص 80)

چھٹا اثر

مولانا نے اصول تفسیر میں اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر میں سب سے پہلے قرآن کریم کو لینا چاہئے۔ اس کے بعد حدیث صحیح کو۔ مولانا اپنی کتاب ”دین اسلام“ کے ص 77 پر لکھتے ہیں:-

”حدیث قرآن مجید کی تفسیر ہے“

حدیث کے بارے میں احتیاطی پہلو اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”حدیث بھی قرآن کریم کی تفسیر کرتی ہے لیکن صرف وہی حدیث قابل قبول ہو سکتی ہے جو شفہ ہو اور جو قرآن کریم کی صریح تعلیم کے خلاف نہ ہو۔“

(دین اسلام از مولانا محمد علی، ص 49)

اردو تفسیر بیان القرآن کے دیباچہ میں مذکور ہے:-

”حادیث صحیح کو تفسیر میں اور باتوں پر مقدم کیا جائے لیکن یہاں چند باتوں میں احتیاط ضروری ہے یعنی اول کوئی حدیث خواہ و صحاح کی ہو قابل قبول نہیں اگر قرآن کریم کی صراحات کے خلاف ہو یا اصول دینی کے خلاف ہو۔“

اور فرماتے ہیں:-

”قرآن مجید کو حدیث پر تقدیم حاصل ہے اگر بخاری بھی قرآن مجید سے تطابق نہ کرے تو

اس کو رد کر دینا چاہئے مگر کتاب اللہ بھی رد نہیں ہو سکتی حدیث قرآن مجید کی صرف تشریف یا تفسیر ہے اور اس وجہ سے بھی قرآن مجید کو حدیث پر تقدیم ہونا چاہئے۔“

(دین اسلام - ص 77)

مولانا نے تقدیم قرآن کا مسئلہ اس وقت پیش کیا جبکہ علماء اسلام نے باوجود اعتقاد اقرآن کریم کو مقدم ماننے کے فرقہ کو قرآن و حدیث پر اور حدیث کو قرآن پر عملاً مقدم کیا ہوا تھا۔ تمام اہل سنت والجماعت کے نزدیک ہر ایک مسئلہ کے لئے خواہ وہ اصول دین سے تعلق رکھتا ہو یا فروع سے، رجوع چار اماموں میں سے ایک کی طرف ہونا چاہئے اور اہل حدیث کے نزدیک حدیث کی طرف۔ اور قرآن شریف کی طرف رجوع نہ کرنے کی دلیل یہ یہ دی جاتی تھی کہ آئندہ قرآن کریم کو ہم سے بہتر سمجھتے تھے اس لئے کسی مسئلہ میں ہمیں اگر قرآن اور امام کے اجتہاد میں اختلاف نظر آئے تو اس صورت میں امام کا اجتہاد قبل قبول ہوگا۔ کیونکہ امام قرآن کریم کو ہم سے بہتر سمجھتا تھا۔ اسی طرح اہل حدیث کے نزدیک قرآن و حدیث کے مضمون میں اختلاف ہو تو حدیث قبل قبول ہے کیونکہ حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کو بہتر سمجھتے تھے۔

مولانا کا اس بارے میں موقف یہ ہے کہ قرآن کریم جس طرح آخر خضرت صلم پر نازل ہوا بلا کم و کاست ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اور حدیث نبی کریم صلم کا کلام ہے، مگر پھر بھی اس کا مرتبہ قرآن کریم کے برابر نہیں، اور کہ وہ قرآن شریف کی طرح محفوظ بھی نہیں۔ کیونکہ اول تو عموماً روایت بالمعنی ہے۔ اور نبی کریم صلم کے پورے الفاظ محفوظ نہیں اور دوسراے وضعی احادیث کی ملاوٹ بھی ہو گئی ہے۔ خود محدثین میں حدیث کے قبل قبول ہونے یا ناقابل قبول ہونے میں اختلاف موجود ہے۔ لہذا اگر حدیث اور قرآن میں کہیں اختلاف نظر آئے تو قرآن کو حدیث پر مقدم کیا جائے گا اور حدیث کی تاویل کی جائے گی اور اگر ایسی تاویل نہیں ہو سکتی، جو اسے قرآن شریف کے مطابق کر دے تو اسے ترک کر دیا جائے گا۔ اور کہ گوفہ آئندہ کبار کا اجتہاد ہے مگر بہر حال امام کا اجتہاد نہ قرآن کا مرتبہ رکھتا ہے نہ حدیث کا۔ اور مجتہد سے بعض وقت باوجود اس کے علم، نیک ارادے کے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ اور فتنہ کا تعلق صرف ان مورسے ہے جن کا ذکر صراحة سے قرآن و حدیث میں نہیں۔ کیونکہ اجتہاد کی ضرورت ہی تب پیدا ہوتی ہے۔ جب قرآن شریف یا حدیث میں صراحة نہ ہو۔ بے شک آئندہ اور فقہاء کا علم ہم سے زیادہ تھا اور ان کا علم حدیث بھی

ہم سے زیادہ تھا۔ پھر بھی تاویل قرآن میں کسی موقعہ پر ان سے غلطی ہو جانا ممکن ہے۔ بسا واقعات امام اجتہاد کرتا ہے لیکن اس کی توجہ ایک ایسی قرآنی آیت کی طرف نہیں جاتی جس میں اس مضمون کے متعلق صراحت موجود ہو، اور اس میں امام کے علم قرآن کی کوئی تحریر نہیں ہے۔ ایسا ہی حدیث کے متعلق بھی ایک امام سے غلطی ہو سکتی ہے یا اس حدیث کا اسے علم ہی نہیں ہے یا علم تھا مگر تحقیق مسئلہ میں اس کی طرف اس کی توجہ نہیں گئی۔

یہ انداز فقر جس کا اوپر ذکر ہوا سب مسلمان فرقوں میں پایا جاتا تھا وہ سب اپنے اپنے ائمہ کے اقوال کو قرآن شریف پر عمل آتی تھی دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن شریف کی طرف سے جوان کی حیات تو می کا اصل سرچشمہ تھا تو جہٹ گئی، اور اس کی تلاوت صرف نمازوں میں یا ثواب کے لئے رہ گئی۔ فتنہ ہی کو شریعت اسلام سمجھ لیا گیا اور اسلام کے سید ہے سادے عقائد میں طرح طرح کی پیچیدگیاں داخل ہو گئیں۔ یورپ کے عیسائیوں نے جو کتابیں اسلام پر لکھیں ان میں انہوں نے اپنی تحقیق کی بنیاد فتنہ کی تابوں پر رکھی اور اسلامی عقائد کو ایک خاصہ گورنمنٹ ہنا کر یورپ کو اسلام سے تنفس کرنے کی کوشش کی ہے^(۱))

مولانا نے ”قرآن کریم۔ حدیث اور فتنہ پر مقدم ہے“ کے اصول کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کی تفسیر کی۔ اور اسی پر تمام اصلاح و تبلیغ کی بنیاد رکھی۔ نئی تفاسیر پر مولانا کا یہ رنگ نمایاں ہے اکثر میں فتنہ پر زور نہیں دیا گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ترجمہ تفسیر قرآن میں اسی موقف کو پیش کیا ہے۔ مولانا مودودی اپنی تفسیر تفہیم القرآن کے مقدمہ 38 پر لکھتے ہیں۔ ”احکام کا مأخذ بھی بالاتفاق قرآن اور سنت کو مانا جائے۔“ یہاں مولانا نے فتنہ کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

(۱) ہمارے قدامت پسند علاماء کے نزدیک متفقین کی تفاسیر اور تصنیفات ہی دین کی واحد اساس اور حرف آخر ہیں۔ کیونکہ وہ اجتہاد کا دروازہ بند کر چکے ہیں۔ جدید مسائل اور علوم سے بے نیاز ہو کر بڑی بڑی تفسیریں اور کتابیں لکھ کر اپنے عالم فاضل ہونے کا رعب جاتے ہیں۔ آسانی پیدا کرنے کے مجاہے جن چون کریشیں اور عسیر افہم جملوں اور تکمیلوں کا استعمال کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ جدید تعلیم یا نئی طبق اصل دین سے بے خبر ہتا ہے۔ مذہب سے متعلق اس کے ابھاں اور شکوک بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ یقیناً مولانا عبدالمالک ماجد دریابادیؒ: ”حضرت شاہ عبدالقدور اور شیخ انہندو غیرہ کے ترجمہ قرآن اور حواشی بجائے خود یہی صحیح و قابل تدریسوں مغلکلین اور مذہبیں کے لئے مفید نہیں۔“ (مکتبات سلیمانی۔ جلد 2۔ حاشیہ 801)

اس رائے کی تائید کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم لکھتے ہیں:
”آپ نے صحیح لکھا ہے کہ ان بزرگوں کے ترجمے مغلکلین اور مذہبیں کے لئے مفید نہیں، اس لئے حواشی بھی ان کے لئے مفید نہیں۔“ (ایضاً۔ (خوشید))

آج پاکستان بھر میں یہ اواز اٹھ رہی ہے کہ پاکستان کا آئین قرآن و سنت کے مطابق ہو۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے بھی قرارداد مقاصد کے ذریعہ یہ طے کر دیا ہے کہ اس ملک کا دستور اُسی کتاب عزیز (قرآن) کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ہوگا۔ غلام احمد پرویز صاحب نے تو اس معاملہ میں ایک قدم اور بڑھایا ہے کہ وہ فقہ کے ساتھ ساتھ حدیث کا بھی انکار کر بیٹھے اور صرف قرآن اور قرآنی نظام کے داعی ہیں۔

ساتواں اثر

قرآن کریم میں بعض سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات (الم) وغیرہ آتے ہیں یہ مقطعات درحقیقت مفردات نہیں ہیں ان کے متعلق منقاد میں سے لے کر متاخرین تک بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس باب میں مختلف ارباب تحقیق کی آراء مختلف ہیں۔ اس حد تک قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ عربوں میں الفاظ کو مخفف کر کے بولنے کا روان تھا۔ مخفف کرنے کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ اہم الفاظ کا ایک ایک حرف لے لیا جائے اور ان حروف کے مجموعہ کو ان الفاظ کا مجموعہ تصور کر لیا جائے۔

مولانا محمد علی صاحب^ر کا موقف ہے کہ قرآن کریم بنی نوع انسان کی رشد و بہادیت اور اس کی تعلیم و تنبیہم کے لئے ہے۔ اس میں وہ کچھ نہیں جو انسان کے لئے نہ ہو اس لئے قرآن میں ہر حرف ہر لفظ اور ہر آیت پر انسانی غور و فکر کا اثر ہو سکتا ہے۔ اور حروف مقطعات کے بارے میں عموماً منقاد مفسرین کا یہ نظریہ رہا ہے کہ یہ ایسے حروف ہیں جن کا علم سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ ان پر غور و فکر اور ان کے معانی نکالنا گناہ ہے۔ مولانا محمد علی صاحب^ر نے ان مقطعات کے معنی کے ہیں اور وہ ان کو بالعلوم اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنی کے مخففات قرار دیتے ہیں۔ مثلاً الم ”میں اللہ کامل علم رکھنے والا“ اور کھیلیعَصْ ”کافی۔ ہادی برکت والا عالم، صادق (خدا) کے مخففات ہیں۔“ مولانا مددوح کا یہ رنگ غلام احمد پرویز صاحب کے ”مفہوم القرآن“، بشیر الدین محمود احمد ربوہ کے ترجمہ و تفسیر، پیر صلاح الدین اور دیگر انگریزی و اردو تراجم میں نظر آتا ہے۔

آخر

نومسلم انگریز مارمیڈ یوک پکھال نے 1930ء میں انگریزی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ ماہ

نامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور نے قرآن نمبر ص 643 پر ان کے انگریزی ترجمہ قرآن کے بارے لکھا:-

”تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اس ترجمے کو پڑھ کر اطمینان کی سانس لی اور کہا کہ اب جا کر ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ اپنی کتاب دوسروں کے ہاتھ میں دے سکیں۔“
مارمیڈ یوک پکھال مولانا کے علم و فضل سے متاثر ہیں اور اس کا اعتراض وہ اس طرح کرتے ہیں:
”کسی زندہ انسان نے اسلام کی تجدید کے لئے لاہور کے مولانا محمد علی صاحب سے زیادہ قیمتی اور طویل خدمات انجام نہیں دیں..... جو قرآن و سنت سے خوب واقف ہے.....“ (رسالہ اسلام کلپر، اکتوبر 1936)
الحان حافظ غلام سرور صاحب جنہوں نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ خود بھی کیا ہے، لکھتے ہیں:-

”پچھلے 35 سال سے مولانا محمد علی نے اپنے آپ کو اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ ان کا انگریزی ترجمہ قرآن صرف ایک ہی کتاب نہیں ہے جو انہوں نے لکھا ہو مگر اس کی وجہ سے ان کا نام قرآن کی خدمت کرنے والوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ 1917ء جب سے یہ ترجمہ چھپا ہے اس کی قدر و قیمت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ انگریزی زبان میں کوئی اور ترجمہ یا تفسیر ایسی نہیں جو مولانا محمد علی صاحب کی اس معزکتہ الاراء تصنیف کا مقابلہ کر سکے۔“
ان دونوں مترجموں کے متعلق ”مسلم ورلڈ“ جولائی 1931ء (صفحات 294-289) میں پادری زویر لکھتے ہیں کہ :-

”یہ دونوں اصحاب اکثر و پیشتر مولانا محمد علی کے ترجمہ کا ہی اتباع کرتے ہیں یہاں تک کہ فرق معمولی الفاظ کا رہ جاتا ہے اور یہ کہ مولانا کا ترجمہ ایک نہایت وسیع و جامع اور دقیق ریسرچ پرمنی ہے اور اس رنگ میں باقی کے تراجم اور بچنل نہیں کہلا سکتے۔“

حافظ غلام سرور صاحب اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں مولانا محمد علی صاحب کے

ترجمہ و تفسیر کے بارہ میں لکھتے ہیں:-

”انگریزی زبان میں مولانا محمد علی کے معرب کتاب الاراء ترجمہ قرآن کے مقابلہ کا کوئی اور ترجمہ یا تفسیر نہیں ہے۔ میں نے دس سال تک اس ترجمہ و تفسیر کو اپنے آپ سے جدا نہیں کیا۔ دنیا بھر میں جہاں کہیں گیا ہوں اسے اپنے ساتھ رکھا ہے۔ مکہ معظمہ میں حج کے موقع پر میرے ساتھ تھا۔ 1924ء میں مذاہب کی لندن کانفرنس میں یہ میرے ساتھ تھا اور دوسرے اجتماعات اور مقامات پر جہاں کہیں گیا ہوں یہ قرآن میرے ساتھ رہا ہے۔“

نہ صرف دو اہل علم و قلم اصحاب پر مولانا کے ترجمہ و تفسیر کا اثر تھا بلکہ اکثر و بیشتر ترجم و تفاسیر کا یہی رنگ ہے جن میں نہ صرف مولانا کے افکار و نظریات کی، ہی پیروی کی گئی بلکہ اس کے ترجم بھی غیر ملکی زبانوں میں بکثرت ہوئے۔ ماہنامہ سیارہ ڈا جسٹ ”قرآن نمبر“ کے مطابق:-

”مدارس کے ایک اور مرہٹہ بزرگ مسٹر ونکنار نے مولوی محمد علی صاحب کے انگریزی ترجمہ قرآن سے تلیگو میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔“ (صفحہ 637)

”احمد یہ اجمن اشاعت اسلام لاہور کا جرمن ترجمہ قرآن مع تفسیر بمقام برلن 1938ء میں شائع ہوا۔ یہ جرمن زبان میں پہلا مستند اور صحیح ترجمہ ہے۔ تفسیر یورپ کے مذاق اور ضروریات کو مد نظر رکھ کر کی گئی ہے۔“ (ص 635)

”کسی یہودی نے چینی زبان میں ترجمہ کیا جس میں مولانا محمد علی امیر جماعت احمد یہ لاہور کے انگریزی ترجمہ سے مدلی گئی ہے۔“

”مسٹر نرائن راؤ ایم اے۔ ایل ٹی نے..... قرآن کریم کا ترجمہ تلیگو زبان میں کیا ہے انہوں نے مولوی محمد علی صاحب ایم اے امیر جماعت احمدیہ لاہور کے انگریزی ترجمہ سے مدلی ہے۔“

”علامہ عبداللہ یوسف علی۔ مسٹر پتھمال ان دونوں نے مولانا محمد علی صاحب کے ترجمہ و تفسیر سے استفادہ کیا ہے۔“ (مجاہد بکیر۔ صفحہ ۱۲۰)

مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد علی صاحب کے ترجمہ و تفسیر سے کس قدرتمند تھے اس کے بارے میں پچھلے اوراق میں بیان ہو چکا ہے۔ یہاں ان کے اپنے قلم سے ایک حوالہ درج

کرنا ضروری ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنے ترجمہ و تفسیر کی تالیف میں مولانا محمد علی صاحب کے ترجمہ و تفسیر کو سامنے رکھا۔ مولانا لکھتے ہیں :-

”ان سطور کے راقم آثم نے بھی بہت سے مخلصوں اور بزرگوں کی بہت افزاں سے 1933ء میں اس کام کو ہاتھ لگایا۔“ خیال یہ غالب رہا کہ پکھال، محمد علی وغیرہ کے ترجم موجود ہی ہیں اور اردو میں بھی خاصاً خیرہ مہیا ہے ان کی مدد سے آسانی کام چل جائے گا۔“ (سیارہ داجستہ لاہور۔ صفحہ نمبر 643)

مولانا عبدالماجد کا انداز ترجمہ و تفسیر مولانا محمد علی صاحب کے انداز ترجمہ و تفسیر سے بالکل ملتا جاتا ہے۔ پہلے وہ ترجمہ عربی لغت کے مطابق کرتے ہیں پھر الفاظ و آیات کے معنی میں مختلف مقامات کے حوالہ جات بمعہ عبارت دیتے ہیں۔ پھر تفسیری مقامات میں آثار و اقوال آئندہ مفسرین، تاریخ و کتب سماوی اور اپنی رائے دیتے ہیں۔ اسی قسم کی پیروی مولانا مودودی کی تفہیم القرآن میں بھی نظر آتی ہے۔ قابلی مطالعہ میں مولانا کے انداز کو سامنے رکھا ہے۔

نوال اثر

مولانا نے اپنی تفسیر میں ہر ممکن اس پہلو کو پیش نظر رکھا ہے کہ جو کچھ غلطیاں تعلیم اسلام میں پڑ گئی ان کو دور کیا جائے اور جو اس کی نمایاں خصوصیات لوگوں نے بھلا دی ہیں ان کو ظاہر اور روشن کیا جائے۔ تاکہ اسلام پھر دنیا میں اسی طرح کشش اور جذب کا موجب بن سکے جس طرح یہ پہلے تھا۔ مولانا نے بڑے دلائل و برائین سے یہ حقیقت آشکارا کی ہے کہ اسلام ایک زندہ مذہب ہے۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے۔ جو انسان کی فطرت کو اپیل کرتا ہے۔ اس کی کوئی تعلیم خلاف عقل نہیں۔ چنانچہ مولانا نے عقلی رنگ میں اسلام اور اصول اسلام کی صداقت کو قائم کیا ہے۔ اسلام ایک علمی مذہب ہے اور ہر زمانہ میں علمی ترقیات کو پیدا کرنے کا ذریعہ رہا ہے۔ مادی علوم میں ترقیات آخر انسانوں کی روحانی ترقیات کی طرف لے جائیں گی۔ روحانی امور بحق ہیں ان کا انکار محض کی علم کی وجہ سے ہے۔ اور علوم کی ترقی کے ساتھ اسلام ترقی کرے گا۔ جدید تفاسیر میں اب یہ رنگ نمایاں ہے۔

دسوال اثر

قرآن کریم مذہبی کتب میں شاید اکیلی کتاب ہے جس نے عقل و علم کے استعمال پر زور دیا ہے۔ اسلام اپنے اصول و فروع کے لحاظ سے ایک عقلی مذہب ہے اس کی تعلیم اور اس کے عقائد کو

جانچنے میں عقل کا پورا دخل ہے۔ عقل اور علم دوش بدش چلنے والی چیزیں ہیں۔ قرآن کریم خلاف عقل و علم قصوں اور کہانیوں سے پاک ہے۔ نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کے اندر کوئی ایسے امور نہیں جو سائنس یا عقل کے خلاف ہوں بلکہ یہ بھی دکھایا ہے کہ اس نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر ایسے ایسے علمی امور کا اکتشاف کیا ہے جن کو علمی دنیا نے آج دریافت کیا ہے۔ اور واقعات اس کے کلام الہی ہونے پر گواہ ہیں۔ گویا سائنس کو خود مذہب کا خادم بنا کر دکھایا۔ مولانا نے نئے تعلیم یا فتنہ کروہ کی طرح مذہب کو سائنس کے ماتحت نہیں کیا بلکہ سائنس کو مذہب کے ماتحت کر کے دکھایا۔ چنانچہ نئے دور کی تفاسیر میں مولانا کے نظریات کی تائید کی جا رہی ہے، اور مولانا کے موقف کو بڑی شرح و مسط سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس پہلو میں مفسرین پر مولانا کا اثر غالب نظر آتا ہے۔

گیارہوال اثر

مولانا کی تفسیر کے مطابع سے عام طور پر جوبات کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی سادہ اور حق تعلیم کو اور اس کے علمی اور پر حکمت اصول کو جو دنیا کے لئے موجب کر شش ہے اور جن کی وجہ سے اسلام دلوں میں گھر کر جاتا ہے اپنی اصلی صورت پر قائم کیا جائے۔ تاکہ دوبارہ اسلام میں پھر وہی جذب اور کر شش پیدا ہو جائے جو پہلے تھی۔ تاکہ اسلام کا قدم پھر دنیا میں بڑھے۔ مولانا کے سینے میں جوش بھرا ہوا ہے کہ وہ اسلام کو دنیا کا غالب مذہب دیکھیں اور ان کے دل میں یہ یقین بھرا ہوا ہے کہ خواہ ظاہری سامان کیسے ہی کمزور نظر آتے ہوں اسلام یقیناً غالب ہو کر رہے گا۔

آج کی تفاسیر اسی جوش اور یقین سے معمور نظر آتی ہیں۔ جنہوں نے غیر محسوس طور پر اسلام کو ایک فتحانہ رستے پر ڈال دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام از سر نو دلوں پر قبولیت حاصل کر رہا ہے۔

بارہوال اثر

قرآن کریم اور احادیث میں بعض خارق عادت واقعات مجذبات اور عظیم الشان عجیب و غریب پیشگوئیوں کا ذکر ہے۔ مولانا ان کو ظاہر پر محظوظ نہیں کرتے بلکہ اس کے مجازی معنی مراد لیتے ہیں اور پیشگوئیوں میں اکثر استعارہ اور مجاز کو دخل دیتے اور کشوف و روایا کی تعبیر و تاویل کرتے ہیں۔ الفاظ ابن مریم، داتہ الارض اور احادیث نزول ابن مریم، احادیث دجال۔ احادیث خرونج یا جون و ماجونج۔ احادیث فتن اور احادیث آثار قیامت، احادیث مسیح و مہدی وغیرہ سب اسی ذیل

میں لاتے ہیں (۱) اور دیگر موضوعات حقیقت صفاتِ الہی۔ عرشِ الہی۔ حقیقت ملائکہ۔ شعیف ابراہیم۔ باروت ماروت۔ جن والپیس۔ وحی الہی، نبوت و رسالت، اور اولیاء کی وحی۔ مسئلہ شفاعت۔ ختم نبوت، معراج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم،بعثت مجددین، بعث بعد الموت، عالم برزخ، اعمالنا میں۔ میزان، نماء جنت۔ حور و غمان۔ دارالسلام، اقامۃ اللہ، تقدیر، تخلیق خیر و شر، لوح محفوظ وغیرہ موضوعات پر مولانا نے جو اپنی تفسیر میں تشرح و توضیح کی ہے موجودہ دور کی جن تفاسیر میں اس کا نمایاں اثر ہے ان میں مشہور پوش مسلمان محمد اسد کا مگریزی ترجمہ مع تفسیری نوٹ ہے جسے رابطہ اسلامیہ کے معظمہ نے 1964ء میں شائع کیا ہے اور مندرجہ ذیل تراجم و تفاسیر بھی مولانا کے نظریات کے نمائندہ ہیں :-

- انگریزی ترجمہ و تفسیر از غلام سرو مطبوعہ آسکفورڈ 1930ء
- انگریزی ترجمہ و تفسیر از محمد مارمیدیوک پکٹھال مطبوعہ لندن 1930ء
- ترجمہ اگریزی و تفسیر از علامہ یوسف علی محدث 1935ء
- ترجمہ اگریزی از مولوی شیر علی مطبوعہ ہالینڈ۔
- ترجمہ و تفسیر از امام ایم اے بکر، کیپ ٹاؤن 1961ء
- ترجمہ و مختصر حواشی و متن از خادم رحمان نوری شیلانگ 1964ء
- ترجمہ و تفسیر از مسٹر رائے بے زبان تلکو
- ترجمہ و حواشی از منہاج الدین انڈونیشیا 1967ء

(۱) الحمد للہ! اب دو حاضر کے بھی روشن خیال علماء اسی رستہ پر چل پڑے ہیں۔ اس کی تازہ مثال میں الاقوامی ثہرت یافتہ عالم دین مولانا وحید الدین خان کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جو انہوں نے ”قیامت کا الارم“ کے عنوان سے ”الرسالة“ (بیتِ تحریک 2010ء) میں شائع فرمایا ہے۔ اس فکر انگریز عالمانہ مقالے میں مولانا موصوف نے یا جوں و ماجوں کا خروج، دجال کا ظاہر ہونا، مہدی کا ظاہر، مسیح کا نزول، مومیاتی تبدیلی، وفات مسیح، ہجداد کا اسلامی نظریہ یعنی نازک اور مقنعاً میں موضعات کو کامل تحقیق و تدقیق کے بعد عام فہم زبان میں بیان کیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مدت میں یہ کے طویل مطالعہ اور غور و خوبش کے بعد مولانا وحید الدین خان جس تیجے پر پہنچے ہیں، وہ بالکل وہی ہے جس کم و بیش سو سو سے حضرت مولانا محمد علی کی تصفیات میں تیز دگر احمدی شریپر میں دوہرایا جا رہا ہے۔ مولانا خاصاً اپنے مقالے کے آخری صفحہ پر ایک نوٹ چوکھے میں خاص طور پر نہیاں کر کے چھاپا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:-

نوٹ: زیرنظر مقالہ دو سال پہلے تیار کیا تھا۔ اس درمیان اس مقالے کو بہت سے اعلیٰ تعلیمی یافتہ افراد کو برائے مطالعہ دیا گیا۔ انہیا کے اندر بھی اور انہیا کے باہر بھی۔ خاص طور پر انہیا کے تقریباً تمام تینی اداروں سے ملک افراد کو اسے پڑھنے کے لئے دیا گیا۔ اس کو پڑھنے کے بعد تمام اعلیٰ علم نے اس سے بنیادی طور پر اتفاق کی۔ کسی بھی عالم کی طرف سے کوئی قابل ذکر اختلاف سامنے نہیں آیا۔ اس طرح کے دو سال گزارنے کے بعد اب الرسالہ میں اس کو شائع کیا جا رہا ہے۔ (25 مارچ 2010ء)۔ (خوشید)

• ترجمہ و مبسوط حواشی حامل متن از مولانا صدر الدین صاحب، برلن جرمن 1940ء

• ترجمہ و حواشی از نو مسلم محمد یوسف گرنچی بہ زبان گورمکھی 1921ء

• ترجمہ و تفسیر از مسرا ابراهیم لورا بہ زبان ہسپانیہ 1966ء

یہاں مولانا سوز صاحب کا تحقیقی مقالہ ختم ہوا۔

نوٹ از مولف: "انٹرنسیٹ پر <http://WWW.clay.smith.name> نے مسلمانوں کے آٹھ مشہور انگریزی ترجموں کو ایک ایک آیت کر کے "The Parallel Qur'an" عوام کے تحت شروع سے اخیر تک درج کیا ہے۔ ایک سرسری نظر کے بعد ہی قاری کو خود بخوبی پڑھ جلتا ہے کہ ما بعد کے متوجہین نے مولانا محمد علی کے انگریزی ترجمۃ القرآن کا کس قدر اتباع کیا ہے۔ حال ہی میں مولانا وحید الدین خان نے ایک انگریزی ترجمہ بلا متن شائع کیا ہے (حالانکہ اس سے قبل خان صاحب کی اردو تفسیر "ذکر القرآن" کا انگریزی ترجمہ بھی منظہ شہرو دپ آچکا تھا۔ جس میں انہوں علماء کی مروجہ فتح کے پیش نظر وفات مسیح" کا انکار کیا ہے)۔ لیکن اس جدید ترجمہ میں وفات مسیح" کا کھل کر اقرار ارہے۔ ترجمہ کے آغاز میں قرآن پاک کے ابتدائی انگریزی متوجہین کی فہرست بھی شامل ہے۔ لیکن افسوس کہ اس میں مولانا محمد علی کا نام نہیں ہے (؟)۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حضرت مولانا محمد علی کی مشہور عالم انگریزی تفسیر کا ترجمہ جرمن، فرانچ، روی، اٹالین، سپینیش، ترکی، ایڈنین اور عربی زبانوں میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ مزید آدھ در جن زبانوں میں کام ہو رہا ہے۔ ایک حصیم ہندی تفسیر پر لیں میں جارہی ہے۔ اس تفسیر میں مولانا محمد علی کی انگریزی اور اردو دونوں تفسیروں کو مکجا کیا گیا ہے۔ یہ تفسیر بنیادی طور پر ہندو بھائیوں کے ذہن اور ضرورتوں کو منظر کر کر تیار کی گئی ہے۔ اس لئے اس کا پس منظر ہندو مت ہے۔ اور ساتھ ہی سائنس سے متعلق جدید topics کو بھی زیر بحث لا یا گیا ہے۔"

”بیان القرآن“

کچھ عدیم المثال شہ پارے

- 1- سورة الفاتحہ کی عظمت
- 2- منعم علیہم کون ہیں؟
- 3- اللہ یستھنیٰ بِهِمْ کی تشریع
- 4- بنی اسرائیل کا بندربنا
- 5- ابن مریم نام کی وجہ
- 6- غذاوں کا اثر اخلاق پر
- 7- شراب اور جوا
- 8- سورت کی گواہی
- 9- حضرت مریم صدیقہ کو ملنے والا رزق
- 10- بن یامین کی بوری میں پیالہ رکھنے والے حضرت یوسف نہ تھے
- 11- حضرت سلیمان اور ان کے عصا کو دیک کے کھانے کا قصہ
- 12- آیت خاتم النبیین اور اس کی تشریع
- 13- سورة الاخلاص

”بیان القرآن“

کچھ عدم المثال شہ پارے 1۔ سورۃ الفاتحہ کی عظمت

ابتداء میں رکھا جانے کی وجہ

صحیح احادیث میں اس کو اعظم السور فی القرآن کہا گیا ہے۔ یعنی قرآن کریم کی سب سے زیادہ عظمت والی سورت، اس کی عظمت اول تو خود اس سے ظاہر ہے کہ نماز میں جسے مومن کا مسراج قرار دیا گیا ہے ہر رکعت میں اس سوت کا پڑھنا ضروری ہے اس کے ساتھ اور جہاں سے چاہے پڑھ لے۔ خلاصہ تعلیم قرآنی: پھر اس کا نام ام الکتاب بتاتا ہے کہ یہ سورت گویا قرآن کریم کی تعلیم کا نیچوڑ اور خلاصہ ہے۔ قرآن کریم کی اصل غرض حمادہ اللہی کا بیان کرنا اور انسان کو اپنے حقیقی کمال تک پہنچانا ہے۔ چنانچہ اس سوت کے پہلے حصہ میں وہ محمد مذکور ہیں اور پچھلے حصہ میں انسانی کمال کے حصول کا ذکر ہے۔ پھر اس سورت کو **الْحَمْدُ لِلّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ** سے شروع کر کے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کا ہی ذکر کر دیا، بلکہ نسل انسانی کی بھی وحدت کی بنیاد رکھ دی اور عالمین کا لفظ استعمال فرمایا کہ ساری تقریقات قومی کو دور کر دیا اور یہی مذہب کا خلاصہ ہے کہ وہ خدا کی ربوبیت اور انسانوں کی اخوت کو قائم کرے۔ اور ان الفاظ **الْحَمْدُ لِلّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ** سے بہتر الفاظ میں یہ خلاصہ نہیں ہو سکتا۔

فاتحہ میں عقائد باطلہ کی تردید

پھر اس سوت کے اندر جن صفاتِ اللہی کا ذکر ہے وہ گویا کل صفاتِ اللہی کے لئے بطور اُمّ یا جڑ کے ہیں۔ یعنی ربوبیت، رحمانیت، رحمیت اور مالکیت۔ انہی سے باقی صفاتِ اللہی بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان چار صفات میں دوسرا کمال یہ ہے کہ مذاہب عالم کے کل اصول باطلہ کی ان میں تردید

ہے۔ صفتِ ربویت میں اس بات کا رد ہے کہ خدا کی ذات یا صفات میں کوئی شریک ہو سکتا ہے۔ وہ روح اور مادہ کا بھی رب ہے اس لئے روح اور مادہ اس کی کسی صفت میں جیسے غیر مخلوق ہونا شریک نہیں ہو سکتے۔ ایسا ہی بت پرستی اور ہر قسم کے شرک کی تردید ہے کیونکہ مستحقِ حمد و عبادت وہی ذات ہو سکتی ہے جو دوسروں کی ربویت کرے اور ربویت کرنے والی ذات صرف ایک ہی ہے۔ صفتِ رحمانیت میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا بدل رحم کرتا ہے۔ کفارہ کے عقیدہ کی تردید ہے کیونکہ کفارہ کے عقیدہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ رحم بلا بدل نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس کا بیٹھا انسانوں کے گناہوں کا معاوضہ بنایا جاتا ہے۔ مگر رحمانیت چاہتی ہے کہ خدا کا رحم انسانوں پر بلا بدل بھی ہو، جیسا کہ اس کی مخلوق میں ہم کو نظر آتا ہے کہ انسانوں کے پیدا ہونے سے بھی پہلے وہ ان کے لئے سامان مہیا فرماتا ہے۔ صفتِ رحمیت میں، جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے اعمال پر جو اس کے قوانین کی فرمانبرداری میں ہوں، اللہ تعالیٰ بڑے بڑے اجر دیتا ہے۔ ایسے عقائد کی تردید ہے جو انسان کے اعمال کے محدود ہونے کی وجہ سے ان کے اجر کو بھی محدود قرار دیتے ہیں اور اس لئے نجات کو عارضی قرار دیتے ہیں۔ صفتِ مالکیت میں، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گو قوانین کی نافرمانی پر سزا دیتا ہے مگر اس کا معاملہ اپنی خلق کے ساتھ مالک کا معاملہ اپنے ملک کے ساتھ ہے، تاسخ وغیرہ عقائد کی تردید ہے جن کی رو سے اللہ تعالیٰ کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا اور اس لئے ہر گناہ کی پاداش میں انسان کو بے شمار گنجوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

میانہ روی کی تعلیم

اور جس طرح عقائد بالله کی تردید اس حصہ میں ہے پچھلے حصہ میں ہر ایک قوم کی افراط و تفریط کی تردید ہے۔ سوائے اسلام کے جس قدر مذہب پائے جاتے ہیں وہ اپنی موجودہ حالت میں صرف ایک خاص شاخِ اخلاق انسانی پر، ہی سارا زور دیتے ہیں اور اس لئے ان میں تفریط و افراط کی غلطیاں پیدا ہو گئی ہیں، یعنی ایک شاخ پر حد سے زیادہ زور دیا اور دوسروی کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اسلام کی تعلیم کا خلاصہ یہاں اعتدال یا میانہ روی قرار دیا گیا ہے جو ایک طرف تفریط سے بچاتا ہے اور دوسروی طرف افراط سے محفوظ رکھتا ہے۔ پس یوں سورہ فاتحہ میں ہر ایک باطل کی تردید

بھی موجود ہے اور اس کے بالمقابل عقائد اور اعمال میں ان اصول حق کی تعلیم ہے جو بطور بنیاد کے ہیں۔

بہترین دعا

پھر جو دعا اس سوت میں سکھائی گئی ہے وہ دعا بھی اعلیٰ سے اعلیٰ دعا ہے، جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ عیسائیوں کو اپنے خداوند کی دعا کے متعلق بہت کچھ دعویٰ ہے، مگر فاتحہ کے بالمقابل یہ دعا کچھ بھی نہیں۔ وہاں روز کی روٹی کی اتجah ہے یہاں صراط مستقیم کی یعنی کمال انسانی کے حصول کی۔ اس سے دونوں دعاؤں کے مقاصد میں فرق ظاہر ہوتا ہے۔ پھر وہاں گناہوں کی معافی کی اتجah ہے۔ یہاں اس مقام پر پہنچنے کی آرزو ہے جہاں گناہ ہی انسان سے سرزد نہ ہوا ورنہ کسی قسم کے حقوق میں تفریط واقع ہونہ افراط۔ گویا یہ بے گناہ یا موصوم بن جانے کی دعا ہے۔ پس کامل اصول حق کے سکھانے میں، اصول باطلہ کی تردید میں، اللہ تعالیٰ کی حمد و شناسکھانے میں اور کمال انسانی تک پہنچانے میں اس کی نظیر نہ تورات میں ملتی ہے نہ انجیل میں، ایسا ہی جو تعلق اللہ تعالیٰ اور اس کے عبد میں ایا کَ نَعْدُوْ ایا کَ نَسْتَعِيْنَ کے خصوص فقرہ میں قائم کیا گیا ہے وہ بھی بے نظیر ہے۔

بہترین وظیفہ

جو لوگ وظائف کے پچھے بھٹکتے پھرتے ہیں وہ اگر افضل الدعا سے کام لیں تو بہت جلد اپنے مقاصد کو پاسکتے ہیں۔ سورہ فاتحہ سے بہتر کوئی وظیفہ نہیں اور یہ وہ وظیفہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بندوں کو سکھایا ہے۔

2۔ منعم علیہم کون ہیں؟

أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے کون مراد ہیں۔ قرآن کریم خود تشریح فرماتا ہے الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّنَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّلِحِينَ (النساء۔ 69) یعنی وہ انبیاء اور صدیق اور شہید اور صالح ہیں۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے لے کر تمام مفسرین نے قبول کی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اہل دینا کی دعا کرنے والا اعلیٰ سے اعلیٰ منازل پر پہنچنے کی دعا کرتا ہے جہاں

نبی، صدیق، شہید، صالح پہنچے، وہیں ہر مسلم پہنچنے کی تڑپ اپنے اندر رکھتا ہے۔ عیسائیوں کی مشہور خداوند کی دعائیں گناہوں کی معافی کی التجا ہے۔ یہاں نہ صرف اس مقام کی دعا ہے کہ انسان سے گناہ ہی سرزد نہ ہو، بلکہ اس مقام پر پہنچنے کی دعا ہے جہاں بڑے بڑے برگزیدگان الٰہی پہنچے۔ یعنی بڑی بڑی خدمات کے بجالانے اور بڑے بڑے کمالات کے حاصل کرنے کا اعلیٰ مقام یا اعلیٰ سے اعلیٰ مقام جس پر کوئی انسان پہنچا ہو۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دعا دروپیہ، مال، مرتبہ کے ملنے کے لئے نہیں۔ کمالات، معرفت، محبت کے حصول کے لئے ہے۔

انعمت علیہم میں مقام نبوت کی دعائیں

یہاں نبی کا لفظ آجائے سے بعض لوگوں کو یہ ٹھوکر لگی ہے کہ خود مقام نبوت بھی اس دعا کے ذریعہ سے مل سکتا ہے اور گویا ہر مسلمان ہر روز بار بار مقام نبوت کو ہی اس دعا کے ذریعہ سے طلب کرتا ہے۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے۔ اس لئے کہ نبوت مخصوص موبہت ہے اور نبوت میں انسان کی جدوجہد اور اس کی سمعی کوکوئی دخل نہیں۔ ایک وہ چیزیں ہیں جو موبہت سے ملتی ہیں اور ایک وہ جو انسان کی جدوجہد سے ملتی ہیں۔ نبوت اول میں سے ہے جیسا کہ الرحمن علم القرآن سے بھی ظاہر ہے۔ دنیا میں کوئی شخص کوشش کر کے اور دعائیں مانگ مانگ کر اور خدا سے التجائیں کر کے نہ پہلے نبی بنانہ آئندہ بنے گا۔ بلکہ خود اللہ تعالیٰ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ کے ماتحت جب چاہتا کسی کو نبوت و رسالت کے منصب پر کھڑا کر دیتا تھا، یہاں تک کہ اپنی کامل ہدایت کی راہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کھول کر تمام آنے والی نسلوں کے لئے مقام نبوت و رسالت کو ایک برگزیدہ انسان کے نام کے ساتھ مخصوص کر دیا اور اس کو النبی اور الرسول کے نام سے پکار کر بتا دیا کہ اب دوسرا نبی اور رسول نہیں ہوگا۔ کیونکہ اگر دوسرا نبی بھی آجائے تو یہ الفاظ مشتبہ ہو جائیں۔ پس مقام نبوت کے لئے دعا کرنا ایک بے معنی فقرہ ہے اور اسی شخص کے منہ سے نکل سکتا ہے جو اصول دین سے ناواقف ہے۔

کن کمالات کی دعا ہے

ایسے بھی لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ اس دعا میں حصول بادشاہت کی دعا ہے کیونکہ بادشاہت کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام قرار دیا ہے (المائدہ۔ 20)۔ اور بعض نے اسے اور بھی

وسع کر کے دنیا کے تمام امور میں صراط مستقیم کی دعا قرار دیا ہے۔ ادنیٰ تدریسے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب باتیں دعا کے اصل مقصد سے دور ہیں۔ بیشک با دشادشت ایک انعام ہے۔ مال و دولت بھی ایک انعام ہے، مگر یہ وہ انعامات ہیں جن میں نیک و بد شریک ہیں۔ با دشادشت ایک انعام ہے مگر ہر ایک با دشادشت منعم علیہ نہیں، دولت ایک انعام ہے مگر ہر دولت منعم علیہ نہیں۔ اور یہاں منعم علیہم کی راہوں کا ذکر ہے نہ خاص خاص انعامات کا مطالبہ۔ پھر منعم علیہم کے مقابلہ پر مغضوب علیہم اور ضالین ہیں جو دولت اور با دشادشت سے محروم نہیں اور نہ دنیا کے کاموں کو سرانجام دینے سے محروم ہیں، بلکہ نیکی سے محروم ہیں، اخلاق فاضلہ سے محروم ہیں۔ دعا صرف اس قدر ہے کہ جن راہوں پر نیک بندے چلتے رہے انہیں راہوں پر چلنے کی ہمیں بھی توفیق دے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ ہمیں انیاء شہدا، صلحاء کے نقش قدم پر چلا۔ اس دعا کے مقابلہ پر امور دنیا کی خواہشات ایک نہایت پست مقام ہے۔

اگر دعا حصول نبوت کیلئے ہے تو امت کی محرومی لازم آتی ہے

اگر یہ دعابت کے حاصل کرنے کے لئے ہوتی تو کم از کم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی مقام نبوت پر کھڑا ہونے سے پہلے سکھائی جاتی۔ مگر قرآن کریم میں اس کا موجود ہونا بتاتا ہے کہ مقام نبوت ملنے کے بعد سکھائی گئی۔ نبوت عطا فرما کر اس دعا کا سکھانا صاف بتاتا ہے کہ حصول نبوت کے لئے یہ دعائیں۔ اور اگر حصول نبوت کی دعائنا جائے تو ماننا پڑے گا کہ تیرہ سوال میں کسی مسلمان کی دعا قبول نہ ہوئی۔ حالانکہ مقریبین اور محبوبین الہی تو ہزاروں کی تعداد میں ہو گذرے۔ خدا خود دعا سکھائے، اس کی غرض یہ ہو کہ دعائماً نگنے والے کو نبوت ملے، دعا کرنے والی امت کو خیر امتہ کہا جائے اور پھر تیرہ سوال سب کے سب محروم رہیں حتیٰ کہ وہ بھی جن کے متعلق صریح سند ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضوان علیہ - اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ نہیں ہو سکتا۔

3۔ اللہ یسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرہ: ۱۵) کی تشریح

(اللہ ان سے مذاق کرتا ہے۔ ترجمہ محسن خان)

اُسْتَهْزَاءُ (لفظی ترجمہ۔ لہسی اڑانا۔ ناقل) کے معنی کشاف نے لکھے ہیں۔ **اِنْزَالُ الْهَوَانَ وَالْحِقَارَةَ**، یعنی ذلت اور حقارت کا نازل کرنا کیونکہ استہزا کرنے والے کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر کرنا ہوتا ہے۔ روح المعانی میں ہے کہ مجاز استہزا سے مراد تحقیر اور ذلت کاوارد کرنا ہے۔ امام غزالی کہتے ہیں کہ استہراء ایسے طریق پر تحقیر کرنے کو کہتے ہیں جس پر بنسی آجائے۔ بیضاوی میں ہے کہ استہزاۓ کی اصل ہوا ہے جس کے معنی خفت ہیں اور یہ معنی سرعت سے ماخوذ ہیں جس معنی میں یہ لفظ آتا ہے۔ گویا استہزاۓ کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر ہے اور ہنسنا ایک ذریعہ ہے جس سے وہ تحقیر کی جاتی ہے۔ محض ہنسنا جس کی غرض دوسرے کی تحقیر نہ ہو استہزاۓ نہیں کہلاتا۔

ایک ہی الفاظ کے اللہ تعالیٰ اور انسان پر بولنے کے مفہوم میں فرق

اب یا ایک اصول کے طور پر یاد رکھنا چاہئے کہ جب کسی فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے۔ تو وہی لفظ بولا جاتا ہے جو انسان کے لئے۔ مگر یہ فرق ہمیشہ ہوتا ہے کہ انسان چونکہ ہر فعل میں آلوں اور ذریعوں کا محتاج ہے اور خدا نہیں اس لئے اس لفظ میں جو آلہ یا ذریعہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوتا، صرف فعل کی آخری غرض مقصود ہوتی ہے۔ مثلاً انسان دیکھتا ہے تو آنکھ اور روشنی کا محتاج ہوتا ہے، مگر جب کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے تو آنکھ اور روشنی جو ذریعہ انسان کے دیکھنے کا ہیں وہ مراد نہیں ہوں گے۔ صرف جو غرض دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے وہ مراد ہوگی۔ ایسا ہی انسان سننے میں کان اور ہوا کا محتاج ہے مگر اللہ تعالیٰ کے سننے میں یہ ذریعہ مفقود ہو گا اور اصل غرض جو سننے سے حاصل ہوتی ہے وہ مراد ہوگی۔ ایسا ہی انسان کا رحم یا غصب اس کے قلب پر خاص حالت کے وادر ہونے کے ذریعے سے پیدا ہوتا ہے مگر خدا کا رحم اور غصب صرف نتیجہ کا نام ہے۔ یہی صورت استہزاۓ کے متعلق ہے جب اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا تو ہنسنا جو ذریعہ تھا وہ مفقود ہو گیا۔ اور ذلیل کرنا جو اصل غرض تھی وہ باقی رہ گئی۔ پس اللہ تعالیٰ کا استہزاۓ صرف ذلیل کرنے کا نام ہے نہ ہنسنے کا۔

کسی فعل پر سزا کا ذکر انہیں الفاظ میں

عربی زبان میں یہ بھی قاعدہ ہے کہ کسی کے ایک فعل پر جو سزادی جائے اس کو اسی فعل کے الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ جب ایک فقرہ جواب کے طور پر ہوتا اس سے مراد فی الواقع وہ فعل نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کے کسی فعل کی سزا ہوتی ہے۔ خود قرآن شریف میں اس کی مثالیں ہیں وَجَزَّ آُوْ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةً مِثْلُهَا (الشوری۔ آیت 41)۔ (ترجمہ۔ اور بدی کا بدلہ اس کی مثل بدی (سزا) ہے۔ ناقل) حالانکہ سزا فی الواقع بدی نہیں۔ فَمَنْ أَعْتَدَ لِعَذَابًا فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ (البقرۃ۔ آیت 194)۔ (ترجمہ۔ پس جو تم پر زیادتی کرتے تم اسکے ساتھ اسی کے مطابق زیادتی کرو یعنی اس کو اسی کے مطابق سزا دو۔ ناقل)۔ حالانکہ دوسرے اعتداء سے مراد صرف سزا ہے نہ فی الواقع زیادتی۔ امام راغب نے بھی اس معنی کی تائید کی ہے اور ایسا ہی لسان العرب میں ہے۔ اسی لفظ کو سزا کے لئے استعمال کرنے میں سزا کے فلسفہ کی طرف اشارہ ہے۔ کہ اس کو ضرورت جائز کرتی ہے۔ پس یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اللہ ان کو ان کے استہزا کی سزا دے گا۔

4۔ بنی اسرائیل کا بندر بننا

كُوْنُوا قَرَدَةً خَاسِيْنَ (65:2) (ترجمہ۔ تم بندر ہو جاؤ)۔ امام مجاهد سے اس کی تفسیر یوں مردی ہے۔ قال مسخت قلوبهم ولم يمسخوا قردة (ڈمنثور۔ ص 75) یعنی ان کے دل مسخ ہو گئے تھے اور صورتیں مسخ ہو کر بندر نہیں بنیں۔ مفردات میں بھی منقول ہے قلیل بل جعل اخلاقہم کا خلاقوها۔ یعنی ان کے اخلاقی بندروں کے سے ہو گئے۔ اس تفسیر کی تائید قرآن کریم کے دیگر مقامات سے ہوتی ہے۔ (النساء۔ آیت 47) میں ہے۔ اوْ نَلْعَنُهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَبَ السَّبْتَ یعنی ہم ان پر لعنت کریں جیسا بت والوں پر لعنت کی۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں پر جو لعنت واقع ہوئی وہی لعنت اصحاب سبت پر ہوئی۔ لیکن اول الذکر بندر نہیں بنائے گئے بلکہ ذلیل کیے گئے۔ اسی طرح دوسری جگہ فرمایا۔ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَكَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الْطَّاغُوتَ طُوْلَئِكَ شَرْمَكَانَا وَاضْلَلَ عَنْ سَوَاءٍ

السَّبِيلٍ. (الماعده۔ آیت ۲۰) یعنی ان میں سے بندرا اور سور بنائے اور وہ جس نے شیطان کی پستش کی یہ لوگ بہت بڑی حالت میں ہیں اور سیدھے رستہ سے بہت دور بکھر کے ہوئے۔ اب جو لوگ بندرا اور سور بنے انہی کے متعلق فرمایا کہ ان کی حالت بہت خراب ہے اور سیدھی راہ سے دور چلے گئے۔ یہ انسان کو ملزم کرنے کا طریق ہے نہ حیوان کو۔ اور قرآن کریم ایسے محاورات سے بھرا ہوا ہے کسی کو گدھ سے مثال دی ہے کمثل الحمار۔ کسی کو کتنے سے کمثل الكلب۔ بندرا یک نقال جانور ہے یعنی انسان کے فعل کی نقل کرتا ہے مگر اس کے نیچے حقیقت نہیں ہوتی۔ پس ان کو بندرا کہنے سے مراد یہ ہے کہ وہ محض نقائی کے طور پر رسوم ادا کرتے ہیں اور ان کے افعال حقیقت سے خالی ہیں۔ یا ذلت کے لحاظ سے ان کو بندرا کہا ہے اور اس کی طرف خاسیں میں اشارہ ہے۔ عربی زبان میں بندر کی مثال زنا کی کثرت کے لئے دی جاتی ہے فلاں ازفی من قرد۔ اور یہودیوں میں اس بدی کی کثرت پر باطل گواہ ہے۔ ”تیرے نیچے وے ہیں جوفش و فجور کرتے ہیں تیرے نیچے باپ کو بھی انہوں نے بے ستر کیا..... کسی نے دوسرے کی جورو سے برا کام کیا ہے اور دوسرے نے اپنی بہو سے بد ذاتی کی ہے اور کسی نے اپنی بہن اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے درمیان خراب کیا ہے۔ (ح قبل 22-9-11) ان تمام باتوں کے لحاظ سے یہ لوگ بندر بن گئے۔

5۔ ابن مریم نام کی وجہ

”حضرت عیسیٰ کے نام کے ساتھ قرآن کریم نے لفظ ابن مریم بڑھایا ہے۔ یہ عیسائیوں پر اتمام جھت کیلئے ہے کہ وہ جسے تم خدا اور بے گناہ بناتے ہو وہ ایک عورت کا بیٹا تھا۔ اور انہی کی کتابوں میں لکھا ہے ”اور وہ جو عورت سے پیدا ہوا ہے کیونکر پاک ٹھہرے“ (ایوب 14:25)۔ پھر عیسائیوں کے خیال کے مطابق گناہ مرد دنیا میں نہیں لایا، بلکہ عورت لائی۔ کیونکہ عورت نے ہی آدم کو ممنوع پھل کھلا لیا۔ پس یہ بتایا ہے کہ جب اس کی ماں موجود ہے تو تم اسے دوسرے انسانوں سے بے گناہ ہی کا امتیاز اس بنا پر کیوں کر دے سکتے ہو۔ کیونکہ جب اصلی گنہگار ٹھہر جاؤں اور اس کے ورشہ میں گناہ کا چلانا ضروری ہے جیسا کہ عیسائیوں کا اعتقاد ہے، تو مریم اس سے کیوں کر پاک ٹھہری۔ علاوہ ازیں

حضرت عیسیٰ کی والدہ کو جو شہرت دنیا میں حاصل ہے اس کا عشرہ بھی ان کے خاوند کو حاصل نہیں۔ اس لئے بھی مریم کی طرف منسوب کرنا اولیٰ تھا۔ جیسے حضرت فاطمہ کی فضیلت کی وجہ سے بنی فاطمہ۔

﴿ محترم رحمت اللہ طارق نے ”برہان القرآن“ ص 303 پر لکھا ہے کہ امام محمد حبیب (860م) نے اپنی نادر روزگار تصنیف ”من نسب الی امہ من الشعرا“ میں جاہلیت اور اسلام کے انتالیس ایسے شعرا کے نام دیئے ہیں جو صرف ”ماں“ کی نسبت سے پکارے گئے۔ خود محترم طارق صاحب نے 166 ایسے مشاہیر کے نام نقل کئے ہیں جن کی نسبت ”ماں“ سے ہے۔ جس طرح مولا نا مودودیؒ حیات مسح کے زبردست حامی ہوتے ہوئے بھی یہ لکھنے پر مجبور ہوئے : ”قرآن نہ اس کی تصریح کرتا ہے کہ اللہ ان کو جسم و روح کے ساتھ کرہ زمین سے اٹھا کر آسمانوں پر کھیں لے گیا اور نہ یہی صاف کہتا ہے کہ انہوں نے زمین پر طبعی موت پائی اور صرف ان کی روح اٹھائی گئی۔ اس لئے قرآن کی بنیاد پر نہ تو ان میں سے کسی ایک پہلو کی نفع کی جاسکتی ہے اور نہ اثبات۔” (تفہیم القرآن۔ جلد اسفحہ ۲۲۰)۔ حیات مسح کے عقیدے کا اس سے بڑھ کر بوداپن اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسکو قرآن پاک کی تائید ہی حاصل نہیں۔ بالکل یہی کیفیت حضرت مسح کے بن باپ پیدا ہونے کی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے صاف صاف لکھا ہے کہ قرآن شریف میں حضرت عیسیٰ کے بن باپ پیدا ہونے کا قطعاً کوئی ذکر نہیں۔ اگر بعض آیات کی ایک مخصوص انداز سے تاویل و تشریح کی جائے تو ان کا بابا پ ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ (دیکھو ”انیاء کرام“۔ مرتب کردہ مولانا غلام رسول مہر)۔ مولانا عبدالmajid ریاضیؒ نے بھی اپنی کتاب ”مطالعہ قرآن“ میں تسلیم کیا ہے کہ قرآن پاک میں حضرت مسح کے بن باپ ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔ خورشید ﴿

حضرت مسح کی بن باپ پیدائش اسلامی عقاید میں داخل نہیں

”عیسائی حضرت مسح کی پیدائش بن باپ مانتے ہیں اور مسلمان بھی عموماً ایسا ہی مانتے ہیں۔ مگر عیسائیوں میں بھی ایسے لوگ ہیں جو بن باپ نہیں مانتے اور مسلمانوں میں بھی۔ ہاں ان دونوں میں ایک فرق ہے۔ اگر فی الواقع حضرت مسح بن باپ پیدا نہیں ہوئے تو اس سے مسلمانوں کے کسی عقیدہ میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا۔ کیونکہ ان کو بن باپ پیدا شدہ ماننا ان کے عقاید میں داخل

نہیں۔ لیکن عیسائیت کی عمارت کی بنیاد ہی اکھڑ جاتی ہے اگر یہ ثابت نہ ہو سکے کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ اگر وہ باپ رکھتے تھے تو نہ روح القدس سے حضرت مریم حاملہ ہوئیں۔ نہ سچ میں الوہیت تھی نہ کفارہ صحیح رہا۔ پس حضرت مسیح کا بن باپ پیدا نہ ہونا عیسائیت کو بخوبی سے اکھڑتا ہے۔ اور اسلام کا اس سے کچھ نہیں بگزتا۔ ایک مسلمان حضرت مسیح کی نبوت کا اس صورت میں بھی قاتل ہے کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے ہوں اور اس صورت میں بھی کہ بابا پ پیدا ہوئے ہوں۔ وہ صرف اس قدر دیکھ لے گا کہ قرآن کریم نے کیا فرمایا ہے یا نبی کریم صلعم کی احادیث سے کیا ثابت ہے۔ اگر ان دونوں میں بن باپ پیدا ہونا مذکور ہوتا ہے لے گا اور نہ نہیں۔۔۔ پس ہم نے صرف اس قدر دیکھنا ہے کہ قرآن شریف یا احادیث نبوی سے اس بارہ میں کیا معلوم ہوتا ہے۔

اب اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اس نے نسل انسانی کے لئے یقانون بنایا ہے ۶۷ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلْلَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينُ (السجدة ۳۲۔ آیت ۸)۔ یعنی آفرینش اول کے بعد اسکی نسل کو نطفہ سے چلا یا ہے۔ اور فرماتا ہے اِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاج (الدھر ۶۷۔ آیت ۲)۔ ہم نے انسان کو مرد عورت کے ملے ہوئے نطفہ سے پیدا کرتے ہیں۔ پس جب تک اللہ تعالیٰ بالنصرت یہ نہ فرمائے کہ عیسیٰ کو ہم نے اپنے اس قانون کے خلاف یا الگ رنگ میں پیدا کیا تھا اس وقت تک یہی مانتا ہوگا کہ وہ اسباب جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے وہ اسی رنگ کے تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کوئی سوال نہیں کہ اس کو ایسا کرنے کی قدرت ہے یا نہیں۔ اُس کو بغیر باپ چھوڑ کر ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا کرنے کی قدرت ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ قرآن شریف سے یا حدیث صحیح سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کیا۔۔۔ اگر کوئی شخص قرآن کریم کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کا بن باپ ہونا تسلیم کیا گیا ہے تو ایسا مانے۔ میرے نزدیک یہ نتیجہ الفاظ قرآنی سے نہیں نکلتا۔ گوئیں اس مسئلہ کو اس قدر اہمیت نہیں دیتا۔ مگر تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ نیک نیتی سے جو کچھ نشانے قرآن سمجھے اس کو ظاہر کر دے۔ وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا تَرْجِمَة۔ اور جس نے اپنی عصمت کو محفوظ کیا (الانبیاء ۲۱ آیت ۹۱) سے بھی اس کے خلاف دلیل نہیں پکڑی جاسکتی۔ کیونکہ احسان کے معنی قید نکاح میں آنا ہے۔۔۔ حدیث ایک بھی ایسی نہیں ملتی کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا ہو کہ حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے۔ بلکہ آپ کی جو گفتگو و فدرجان کے ساتھ لکھی ہے (یہ گفتگو تفسیر ابن جریر، تفسیر کبیر،

تفسیر روح المعانی اور تفسیر دو منثور میں موجود ہے)۔۔۔ اس میں نبی کریم صلعم کے یہ صاف الفاظ مروی ہیں الاستم تعلمون ان عیسیٰ حملته امراۃ کما تحمل المرأة کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰ کو اس کی ماں نے حمل میں لایا جس طرح عورتیں بچوں کو حمل میں لیا کرتی ہیں۔ اور عورتیں بچوں کو اپنے خاوندوں سے ہی حمل میں لیتی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر صفائی سے جب عیسائیوں نے یہ سوال کیا و قالوا له من ابوه یعنی اسکا باپ کون ہے؟ تو آپ نے یہ جواب نہیں دیا کہ اسکا باپ کوئی نہیں۔ بلکہ جواب میں فرمایا الاستم تعلمون انه لا یکون ولد الا و هو یشیہ اباہ کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی بینا نہیں مگر وہ اپنے باپ سے مشابہ ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے یہ بتادیا کہ حضرت عیسیٰ کا باپ انسانوں میں سے ہی کوئی ہے۔ کیونکہ اس کی شکل انسانوں سے ملتی ہے۔ اگر آنحضرت صلعم نے اس بات کو ظاہر کرنا ہوتا کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوا تو جیسا کہ اکثر مفسرین نے لکھا ہے، یوں فرماتے کہ وہ آدم کی طرح بن (ماں) باپ ہے یا کلمہ گُن سے پیدا ہوا ہے۔ پس یہ تمام امور اس بات پر دلیل ہیں کہ قرآن کریم حضرت عیسیٰ کی پیدائش بن باپ بیان نہیں کرتا۔۔۔” (بیان القرآن - ص ۲۱۳ تا ۲۱۴)

﴿ حدیث میں حضرت فاطمہؓ کے بارے میں آتا ہے اَنَّ فَاطِمَةَ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا یعنی حضرت فاطمہؓ وہ خاتون تھیں جنہوں نے اپنی عصمت کو محفوظ کر لیا تھا۔ (حوالہ کے لئے دیکھیں ڈاکٹر طاہر القادری کی تالیف ”الدرۃ البیضاء فی فاطمة الزهراء“۔ یہی الفاظ ہیں جو حضرت مریمؓ کے لئے آئے ہیں۔ تو کیا حضرت فاطمہؓ شہروالی خاتون نہ تھیں؟ علامہ اقبال بھی حضرت مسیح کو عام انسانوں کی طرح باباپ ہی مانتے تھے (دیکھو مجالس اقبال، مرتب جعفر بلوچ - ص ۸۲ نیٹ پرستیاب) (خوشید) ﴾

6۔ غذاؤں کا اثر اخلاق پر

يَأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَبَعُوا أُخْطُوطَاتِ الشَّيْطَنِ (البقرہ: ۱۶۸)

”اے لوگو! اس سے جوز میں میں ہے حلال اور پاکیزہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں کے پیچھے نہ چلو۔“

”جب ہدایت کے اصل الاصول تو حید کا ذکر کیا تو اب کسی قدر ذکر کر ہدایت کی تفصیلات کا کیا

ہے اور بتایا ہے کہ کھانے پینے تک کے احکامات بھی شریعت میں دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ غذاوں کا اثر اخلاق و روحانیت دونوں پر پڑتا ہے۔ یہاں سے لیکر اکتسیویں رکوع تک یہ ذکر چلے گا مگر عموماً انہیں احکام کو بیان کیا ہے جن کا تعلق صبر سے ہے کہ کیونکہ یہی اصل مضمون ہے جس پر بحث شروع ہے۔ اس میں سب سے پہلی ضرورت حلال کھانے کی بتائی۔ جو مال باطل طریق پر حاصل کیا جائے وہ حلال نہیں ہو سکتا۔ دوسری ضرورت طیب کھانے کی بتائی یعنی ستری چیز۔ اس ایک لفظ کو لا کر بہت سی تفصیلات سے مستغفی کر دیا۔ اور کسی قدر اختلاف رواج سے بھی طیب کا اختلاف پیدا ہو سکتا ہے اس لئے عام لفظ رکھا۔ یا یہاں الناس میں جو حکم دیا ہے وہ عام ہے۔ حرام خوری کو ترک کرنے سے بھی اللہ تعالیٰ سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ سعد بن ابی وقار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں کس طرح مستجاب الدعوات بنو تو آپؐ نے فرمایا اَطِبْ مَطْعَمَكَ تَكُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعْوَةِ۔ ستر اکھانا کھاؤ مسجباً الدعوةَ ہوجاءَ گے۔ دنیا اور دین، ظاہری اور باطنی طہارت کے احکام کو کس طرح ملایا ہے۔

ظاہری اور باطنی طہارت کا تعلق

خود قرآن شریف نے بھی غذا کے حکم کے بعد یہ لفظ لا کر کہ شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ باطنی طہارت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غذا بھی اچھی کھاؤ۔ اخلاق بھی اچھے دکھاؤ۔ جیسا کہ اگلی آیت میں شیطان کی پیروی نہ کرنے کی وضاحت کر دی کہ بدی اور بے حیائی کی باتوں سے بچو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسان کی جسمانی اور روحانی حالتوں میں ایک تعلق بتاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات جسمانیات کی طرف سے مضمون کو روحانیات کی طرف اور روحانیات سے جسمانیات کی طرف منتقل کرتا ہے۔

بدی اور بے حیائی کا تعلق غذاوں سے

یہاں یہ اشارہ ہے کہ حرام غذاوں کے استعمال سے سوء اور خشاء پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے مثلاً مردار اور خون کے کھانے سے صحت جسمانی پر براثر اور گندے اخلاق، خزیر کھانے سے بے حیائی۔ اور افترا علی اللہ اسے اس لئے کہا کہ وہ لوگ خود چیزوں کو حلال و حرام قرار دے کر اللہ تعالیٰ

کی طرف منسوب کرتے تھے۔ آج یہ امر مسلم ہے کہ ہر ایک قسم کی غذا اسی قسم کی صفات انسان کے اندر پیدا کرتی ہے۔ مگر قرآن کریم نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر اس حقیقت کی طرف توجہ دلا کر ایسی چیزوں سے روکا۔” (بیان القرآن۔ ص ۹۷)

(اس نکتہ کو ما بعد کے متعدد مفسرین نے بھی اپنی تفسیروں میں پیش کیا ہے۔ خورشید)

7۔ شراب اور جوا

قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعٌ لِلنَّاسِ وَإِنَّمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا (البقرة: 219)

”کہہ ان دونوں میں بڑی برائی ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں اور ان کی برائی ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے۔“

شراب اور جو امہنڈب قوموں کی اور بالخصوص عیسائی اقوام کی دو خطرناک بیماریاں ہیں اور ان کا علاج سوائے اسلام کے اور کسی مذہب نے نہیں کیا۔ بعض بدیاں ایسی موٹی ہیں کہ ان کے بد نتائج تک سب کی نظر پہنچ جاتی ہے اور بعض کے بد نتائج جو نکہ ایک مدت کے بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لئے ہر ایک کی نظر ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ شراب موخر الذکر بدیوں میں سے ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکیلے کامل مذہب نے ہی شراب کے بد نتائج کو دیکھ کر اس سے روکا۔ یہودیوں میں شراب کی حرمت قطعی نہ تھی، بعض اوقات اس کی تعریف بھی کر دی ہے۔ دیکھو قاضیون 9:2-13۔

سموک 16:2-1، مثال 6:31۔ حکماء یہود نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جہاں شراب نہ ہو وہاں دوائیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہندوؤں میں بھی شراب کا استعمال کتب مقدسہ کی بنابر جائز مانا گیا ہے۔ یگر وید میں جو چیزیں دیوتاؤں کو پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک شراب بھی ہے۔ منوسرتی میں ہے کہ ”ماں اور شراب اور ان دونوں کے لحاظے میں کچھ دوش نہیں۔“ منوسرتی سے ہی یہ ثابت ہے کہ بعض مذہبی تیوہاروں میں شراب پینے میں کچھ دوش نہیں۔ عیسائیت نے توحد ہی کر دی کہ مذہب کی بنیاد ہی شراب پر گویا رکھ دی۔ انجیل، (یوحنا: 11-12) میں حضرت مسیح کا سب سے پہلا مجرہ ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شادی میں جب شراب کچھ کم ہو گئی اور لوگ پورے بد مست نہ ہوئے تو حضرت مسیح نے پانی کے مٹکوں کو شراب میں تبدیل کر کے اس کی کو پورا کیا۔ یوں کہنا

چاہئے کہ اس مجزہ میں عیسائی مذہب کی آئندہ تاریخ کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ قوم پانی کی جگہ شراب ہی پیئے گی۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی شخص عیسائی رہ نہیں سکتا جب تک سال بھر میں ایک دفعہ شراب نہ پیئے۔ کیونکہ عیدِ غم میں شراب جزو لازم ہے بلکہ اسی شراب کے گھونٹ کو سچ کے خون کا قائم مقام قرار دے کر اتحاد عیسائیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ گویا عیسائیت کا اجتماع روٹی کے ٹکڑے اور شراب کے پیالہ پر ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ عیسائیت کو چھوڑ کر سب مذاہب میں نیک اور راستباز لوگ شراب سے محنت ب رہے ہیں۔ گوہ دوسروں کو اس سے نہ روک سکے ہوں۔ اور یہودیوں میں تو دو فرقے ایسے تھے جو شراب نہ پیتے تھے۔ مگر شراب کے خطرناک دیوکو ہلاک کرنے کے لئے اسی عظیم الشان قوت قدسی کی ضرورت تھی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوائے اور کسی کو نہیں دی گئی۔ اور آپ کی یہ قوت قدسی اس کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ چیز جس کی خطرناک گرفت سے ایک انسان کو پچانا بھی مشکل ترین کام ہے۔ اس سے آپ نے آنا فاناً ایک قوم کی قوم اور ملک کے ملک کو ایسا پاک کر دیا کہ شراب تو کیا وہ برتن بھی باقی نہ رہے جس میں شراب بنائی جاتی تھی۔ حالانکہ آپ کے ظہور کے وقت عرب کے ملک میں اس قدر کثرت سے شراب پی جاتی تھی کہ اس کی نظیر سوائے موجودہ زمانہ کے یورپ کے اور کہیں نہیں ملتی۔ ادھر حرمت شراب کے حکم کا نازل ہونا تھا دھر شراب مدینہ کی گلیوں میں بارش کے پانی کی طرح بہرہ ہی تھی۔ لوگ خارق عادت امور میں مجرمات تلاش کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کون سا عجاذ ہو گا جس نے آن کی آن میں نسل انسانی کو اس خبیث چیز سے آزاد کر دیا۔ آج امریکہ بھی تیرہ سو سال بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کی نقل کرنے لگا ہے مگر کہاں نبی کی قوت قدسی جو فوراً قوم کو پاک صاف کر دیتی ہے کہاں دنیا داروں کے ریزولوشن جن سے بچنے کے لئے طرح طرح کے حلیے بھی سے نکالے جا رہے ہیں۔

حرمت شراب کی تدریج میں حکمت

ہاں یہ بھی سچ ہے کہ اسلام نے جو فطرت انسانی کو پچانتا ہے حرمت شراب کا حکم تدریجیاً پہنچایا حالانکہ اور کسی بدی کی بیجنگٹنی میں تدریج روانہ میں رکھی۔ چنانچہ اول یہ سمجھایا کہ اس میں کچھ فوائد تو ضرور ہیں جن کی وجہ سے دنیا آج تک اس میں بمتلاہی مگر اس کا نقصان نفع سے بہت بڑھ

کر ہے، اور پھر فرمایا کہ نشہ کی حالت میں نماز میں مت آؤ لَتَقْرُبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكُرٌ (النساء 43) یعنی شراب نوشی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور بالآخر قطعی حکم حرمت سورہ مائدہ میں نازل فرمایا۔ اس کو رجس (پلیدی) قرار دیا اس کو شیطان کا کام کہا۔ فاجتنبو (اس سے بچو) کا حکم دیا اور آخر میں فهل انتم منتهون میں تاکید کے ساتھ زجر فرمایا۔ پس اس تدریجی مگر قطعی حکم حرمت شراب میں بھی ایک حکمت تھی۔

شراب تھوڑی اور بہت یکساں حرام ہے

یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ غوخر کی حرمت اسی وجہ سے ہے کہ اس سے نشہ پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح دیگر نشہ پیدا کرنے والی اشیاء بھی اس حرمت کے اندر آ جاتی ہیں۔ مگر یہ حرمت عام ہے یعنی یہ مطلب نہیں کہ تھوڑی شراب جس سے نشہ نہ ہو پی لینا جائز ہے۔ خصوصیت وجہ سے عمومیت حکم پر اثر نہیں پڑتا۔ اور حدیث میں صاف ہے۔ حرمت الخمر لعینها فلیلها و کنیرها۔ یعنی شراب فی ذاته حرام ہے تھوڑی ہو یا بہت اور یہ بھی ہے ماسکر کشیرہ فقلیلہ حرام جس چیز کی زیادہ مقدار سے نشہ ہو جائے یعنی انسان بد مست ہو جائے وہ تھوڑی بھی حرام ہے۔ اسی طرح خاص قسم کی شرابوں کا جواز نکالنا حکم قرآنی کا ابطال ہے۔ ہاں البتہ دوائی کے طور پر شراب کا استعمال ناجائز نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے کہ دوائی کے طور پر تھوڑی مقدار میں زہر بھی دی جاسکتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حرام سے دوانہ کرو۔ مگر حالت اضطرار میں سو رجھی جائز ہے اس لئے حالت اضطرار اس سے مستثنی ہے۔

8۔ عورت کی گواہی

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَآءَيْتُمْ بِدَيْنِ إِلَى أَجَلٍ مُسَمَّى فَاكْتُبُوهُ طَوْلِيْكُتُبْ
بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلِمَ اللَّهُ
فَلْيَكْتُبْ وَلِيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحُقُوقُ وَلِيُنَقِّلَ اللَّهُ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ
شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًّا أَوْ ضَعِيفًّا أَوْ لَا يَسْتَطِعُ أَنْ
يُمْلِلَ هُوَ فَلِيُمْلِلْ وَلِيُهُ بِالْعَدْلِ طَوْلِيْكُتُبْ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ

لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَأُمْرَاتِنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضَلَّ
إِحْدَاهُمَا فَتَذَكَّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى (البقرة: ٢٨٢)۔ ”اے لوگو! جو ایمان لائے
ہو جب تم آپس میں مقررہ وقت کے لئے قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لو۔ اور چاہیے
کہ تمہارے درمیان لکھنے والا عدل کے ساتھ لکھے۔ اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ
کرے جیسا اللہ نے اسے سکھایا۔ اور ضرور لکھ دے اور چاہیے کہ وہ جس پر حق ہے
لکھائے ۔۔۔ اور دو گواہ اپنے مردوں میں سے گواہی کے لئے بلا لیا
کرو۔ پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے ہوں جنکو تم
پسند کرو۔ تاکہ اگر ایک بھول جائے تو ایک ان دونوں میں سے دوسرا کو یاد
دلادے ۔۔۔“

اس آیت میں ایک ترقی یافتہ قوم کی لین دین کی جملہ ضروریات کو منظر کھا گیا ہے۔ اول
کا تبوں یا وشیقہ نویسون کی ضرورت بتائی۔ وہ لکھنے سے انکار نہیں کر سکتے اور لکھانے والے کو معاوضہ
دینا ضروری ہے۔ دوم۔ گواہوں۔ وہ گواہی دینے سے انکار نہیں کر سکتے۔ مگر جو ان کو لطور گواہ بلاتا
ہے وہ ان کے کاروبار کے ہرجہ کا معاوضہ دے۔ سوم معاملہ کرنے والا پچھہ ہو یا بوجھا یا مال کی
حافظت نہ کر سکتا ہو یا کوئی اور امر مانع ہو تو اس کا ولی مقرر کیا جائے۔ غرض ایک ایک فقرہ میں ایک
ایک قانون کی بنیاد قائم کر دی ہے آگے اس پر قانون بن سکتے ہیں۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے شہادت میں دو گواہوں کا ہونا بمحاذ حالات عامہ ہے۔ عموماً دو
گواہوں سے بات مضبوط ہو جاتی ہے۔ جھوٹ کی ملاوٹ کا اختصار کم ہو جاتا ہے۔ بیان کا جو حصہ
ایک دوسرے کی تائید میں ہو وہ وزنی ہو جاتا ہے۔ یہ حکم نہیں کہ اگر ایک ہی گواہ ہو تو فیصلہ نہ کیا
جائے یا قرآن کی شہادت پر فیصلہ نہ کیا جائے۔ بلکہ حضرت یوسفؐ کے معاملہ میں جہاں قمیض کے
آگے یا پیچھے سے پھٹنے کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا کہ قرآن کی شہادت پر بھی فیصلہ
ہو سکتا ہے۔

عورت کی گواہی

اور ایک مرد کی جگہ جو دو عورتوں کی شہادت رکھی تو اس کی وجہ بھی خود ہی بتا دی، کہ عورتوں کو

چونکہ معاملات لین دین سے واسطہ کم پڑتا ہے، اس لئے ایسی باتوں کو شاید وہ اچھی طرح یاد نہ رکھ سکیں۔ تو ایک کی کمی کو دوسرا پورا کر دے۔ ایسی عورت کی شہادت ناقابل قبول ہونے کا ذکر کہیں نہیں۔ بلکہ لعان کے معاملہ میں جو وزن مرد کی چار مرتبہ شہادت کو دیا ہے وہی وزن عورت کو چار مرتبہ شہادت کو دیا ہے گویا مرد اور عورت کی شہادت میں کوئی فرق نہیں کیا۔ ولادت بکارت وغیرہ معاملات میں فقہا نے بھی عورت کی شہادت کو پورا وزن دیا ہے۔

9-حضرت مریم صدیقہؓ کو ملنے والا رزق

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَا الْمُحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا حَقَالَ يَمْرِيمُ أَنِّي لَكِ هَذَا طَقَالْتُ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (ال عمران - آیت ۳۷)۔ ”جب کبھی زکریاؑ کے پاس عبادت گاہ میں آتے اس کے پاس رزق پاتے۔ کہا: اے مریم! یہ تجھے کہاں سے ملا؟ اس نے کہا: **یہ اللہ کی طرف سے ہے۔**“

رزق کے اصلی معنی امام راغب کے نزدیک عطاء جاری ہیں خواہ دنیوی ہو یا آخری، مال ہو یا جاہ یا علم۔ اس لئے رُزْفُتُ عَلَمًا علم دیا پر بولتے ہیں۔ مفسرین نے تو حسب معمول اس کو غیر معمولی رزق قرار دیا۔ حالانکہ یہاں کوئی ایسے لفظ نہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں فاکہہ الصیف فی الشتاء و فاکہہ الشتاء فی الصیف یعنی گرمی کے چھل سردیوں میں اور سردی کے چھل گرمیوں میں۔ حالانکہ قرآن شریف میں نہ روئی کا ذکر ہے نہ چھلوں کا۔ اول تورزق سے مراد چھل ہی لینا اس پر کوئی دلیل نہیں۔ پھر چھل بھی خلاف موسم اور یہ بھی لکھا ہے کہ زکریاؑ اس پر سات دروازوں پر چقل لگایا کرتے تھے۔ ان قفلوں میں تو معمولی چھلوں کا پہنچنا بھی کافی ابیات خلاف موسم بتانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور مجاہد سے روایت ہے۔ وجد عندها رزقاً ای علم اوقال صحفا فیها علم رث) یعنی رزق سے مراد یہاں علم ہے یا صحیحے جن میں علم تھا۔

من عند الله عند ظرف مكان او زمان ہے اور اس کے معنی حضور الشَّيْ وَرُنُوْ یعنی کسی شے کا حضور اور اس کا قرب اور اس پر من داخل ہوتا ہے۔ جس طرح لدن پر من داخل ہوتا ہے۔ یعنی من عندنا۔ من لدننا۔ مفردات میں ہے کہ عندمیں قرب ہے وہ بعض وقت بمحاظ مکان ہوتا ہے اور بعض وقت بمحاظ اعتقاد جیسے عندي کذا یعنی میرے اعتقاد میں یوں ہے۔ اور کبھی مرتبہ کے لحاظ سے جیسے بَلْ أَحْيَاهُ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ میں اور کبھی محض حکم میں جیسے عنده علم

الساعة (الزخرف 85-43) ومن عنده علم الكتاب (الرعد 43) ایسا ہی فاولٹک عند الله هم الكاذبون (النور 13-24) وهو عند الله عظيم (النور 15-24) ان تمام مقامات پر فى حكمه مراد ہے یعنى اللہ کے حکم میں، اسی طرح پروان من شئی الا عندنا خزانہ و ماننزلہ الا بقدر معلوم (الجسر 21-15) اور یہی صورت یہاں ہے من عند الله یعنی اللہ کے حکم سے یہ چیزیں پہنچتی ہیں۔ مفسرین کا خیال ہے کہ اس کو من عند الله اس لئے کہا گیا ہے کہ بلا واسطہ بشر پہنچتا تھا۔ مگر یہ ضروری نہیں ان من شئی الا عندنا خزانہ، جب سب چیزوں کے خزانے اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہیں تو جو کچھ پہنچتا ہے سب من عند الله ہی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا کہ جب ان لوگوں کو کوئی بھلانی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں۔ هذه من عند الله یہ اللہ کا احسان ہے اور جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں هذا من عندك یعنی تمہاری بے تدبیری سے ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا قبل کل من عند الله (النساء 78) بھلانی برائی ہر چیز اللہ کی طرف سے ہی ہے، حالانکہ اسی کی تشریح آگے چل کر یوں کی ہے کہ بدنتاج انسان کے اپنے بد اعمال سے ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے مالا نصر الا من عند الله (آل عمران 3-125) حالانکہ نصرت اسباب کے ساتھ ہی آتی ہے۔ اگر مسلمان قتال نہ کرتے اور حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کی طرح انکار کر دیتے تو یہ نصرت بھی نہ ملتی۔ پس بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ ہر چیز من عند اللہ ہی ہے۔

مریم کے پاس رزق کا پہنچنا

ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بلا اسباب بھی کوئی امر مہیا کر دے یا ایسے اسباب سے مہیا کر دے جن کے سمجھنے پر انسان قادر نہیں، جیسے ویرزقہ من حیث لا يحسب (اطلاق 3-65) اللہ تعالیٰ متنی کو ایسے ذرائع سے رزق پہنچاتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور اگر یہ مریم صدیقہ کی کرامت ہو کہ کسی ظاہری سبب کے بغیر انکو پہنچ جاتا ہو، تو اس سے بھی ہمیں انکار نہیں۔ لیکن سوال صرف یہ ہے کہ آیا قرآن کریم نے یہاں ایسا فرمایا ہے یا کسی حدیث صحیح میں ایسا آیا ہے کہ مریم کو بے موسم کے پھل سات قلعوں کے اندر پہنچ جایا کرتے تھے، اس کا جواب نعمی میں ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ نے ایسا فرمایا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور الفاظ ظاہری سے سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ مریم کے پاس کچھ رزق پہنچ جاتا تھا۔ ممکن ہے

زارئین پہنچاتے ہوں جیسا کہ دستور ہے کہ جو لوگ خلوت نہیں اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں ڈال کر اُن کو پہنچادیتا ہے۔ اور ممکن ہے یہاں رزق سے مراد جیسا جاہد نے کہا ہے علم ہو، اور اس علم کو ہی مریم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا ہو۔ تو اس پر ایک دن جب زکریا نے سوال کیا کہ اے مریم یہ تم کو کہاں سے پہنچتا ہے تو اس نے وہی خدا پرستوں والا جواب دیا۔ جن کی نظر وسائل سے بلند ہوتی ہے اور وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی صحیح ہیں۔ حضرت ابراہیم تو یہاں تک فرماتے ہیں وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِنِي (الشعراء: 79-26) وہ اللہ ہے جو مجھے کھانا کھلاتا اور پانی پلاتا ہے حالانکہ اپنے ہاتھ سے کھاتے اور پیتے تھے۔

کہا جائے گا کہ اگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی تو اسکا ذکر یہاں کیوں کیا۔ لیکن کیا قرآن کریم معمولی امور کا ذکر نصیحت کے لئے نہیں کرتا؟ بلکہ سبق تو انسان معمولی امور سے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ اگر یہ کوئی غیر معمولی امر تھا تو ہمیں اس سے فائدہ کیا، یہ کوئی مجرہ تو ہے نہیں کہ خالقین پر اتمام جحت کے لئے دکھایا گیا ہو۔ نہ کوئی ایسی کرامت ہے جو مکرین کے لئے ظاہر ہوئی ہو، بلکہ بات صاف ہے مسلمانوں کو سمجھانا مقصود ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے دین کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے بھی رزق کا کچھ سامان کر دیتا ہے اور کسی نہ کسی ذریعہ سے اس کو رزق پہنچادیتا ہے۔ بلکہ آخر پر ان الفاظ میں کہ واللہ بزرگ من یشاء بغير حساب یہ بھی بتا دیا کہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ بے حساب رزق دیتا ہے انہی الفاظ میں مسلمانوں کو بھی مخاطب فرمایا ہے۔

ایک اور بات قابل توجہ یہ ہے کہ زکریا ہمیشہ ہی جب اس کے پاس جاتے تو رزق پاتے۔ اگر یہ کوئی غیر معمولی رزق ہوتا تو یہ سوال پہلے دن ہی ان کو کرنا چاہئے تھا کہ اے مریم یہ تم کو کہاں سے ملا۔ حالانکہ عبارت قرآنی بتاتی ہے کہ وہ جب کبھی مریم کے پاس جاتے ایسا پاتے اور سوال نہ کرتے۔ پھر انہوں نے کسی ایک موقع پر ایسا سوال کیا ہے۔ جب انہوں نے مریم میں خدا پرستی کے آثار دیکھے ہیں۔ اگر یہ مراد ہوتی کہ پہلی مرتبہ ہی دیکھ کر سوال کیا تھا تو عبارت یوں ہونی چاہئے تھی۔ لَمَّا دَخَلَ عَلَيْهَا... پس جب مریم کے اندر انہوں نے ایسی نیکی اور سعادت دیکھی تو ان کی طبیعت میں بھی ایک جوش پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی ایسی نیک اولاد دعطا کرے۔ اس

سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکوں کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے تو نیک اولاد کے لئے ہی پیدا ہوتی ہے۔ باوجود بوجھا ہو جانے کے ذکر یا نے اولاد کے لئے دعائیں کی۔ کی تو یہی کی اے خدا نیک اولاد دے۔ (بیان القرآن - ص ۲۰۳ تا ۲۰۴)

نوث: بالکل یہی رائے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے اپنی عالمانہ تفسیر "تدبر القرآن" میں ظاہر کی ہے۔ (خورشید)

10۔ بن یامین کے بورے میں پیالہ رکھنے والے حضرت یوسف نہ تھے

جَعَلَ السِّقَايَةَ (لفظی ترجمہ۔ کسی مرد نے پیالہ رکھا۔ سورہ یوسف ۷۰:۱۲) میں ضمیر کس طرف جاتی ہے؟ مفسرین کا خیال یوسف کی طرف ہے۔ گویا حضرت یوسف نے خود بوری کے اندر پیالہ رکھا۔ مگر اس پر قرآن شریف کے الفاظ کئی قسم کی مشکلات وارد کرتے ہیں۔ خود ایسی کارروائی کر کے پھر سب لوگوں میں یہ اعلان کرنا کہ یہ قافلہ والے چور ہیں۔ آیتُهَا الْعِيرُ انْكُمْ لَسَارِقُونَ۔ ایک نبی کے کس طرح شایان شان ہو سکتا ہے؟ یہ تو ایک معمولی آدمی بھی کرے تو قابل گرفت ہے۔ قرآن شریف میں ہے وَمَنْ يَكُسْبَ حَطَبَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يُرْمِ به مَرِيشًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَ إِثْمًا مُبِينًا (النساء: ۴-۱۱۲) ایک شخص خود ایک گناہ کرے پھر اس کا اذام دوسرے پر لگائے تو وہ ارتکاب بہتان کرتا ہے۔ مفسرین اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ان کو سارق اس لحاظ سے کہا کہ انہوں نے خود یوسف کو اپنے باپ سے چرا یا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو اذام اہل مصر کے سامنے اعلان ہوا وہ تو یہ تھا کہ تم نے پیالہ پچرا یا ہے اور اس کے وہ مرتکب نہ تھے۔ اور آخر کار انہی میں سے ایک کی بوری سے اسے نکال کر اہل مصر کی نظر میں انہیں چور ٹھہرا بھی دیا۔ پس قرآن کریم کا منشاء ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت یوسف نے خود وہ پیالہ بوری میں رکھا یا رکھوایا۔ اس سے پہلے جب روپیہ ان کو اپس کیا گیا تو یہ لفظ ہیں کہ اپنے نوکروں کو کہا کہ ان کا روپیہ ان کی بوریوں میں رکھ دو۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ بوریوں کا بھرنا بھرنا حضرت یوسف کا اپنا کام نہ تھا اور نہ وہ کام آپ کے سامنے ہوتا تھا۔ اس لئے اگر پیالہ حضرت یوسف نے رکھوانا ہوتا تو اسی طرح اپنے نوکروں کو حکم دیتے جس طرح روپیہ رکھنے کے لئے دیا تھا۔ اس لئے اس کا رکھنے والا کوئی اور

تھا۔ قرآن شریف سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت یوسف کے ساتھ ان کے بھائیوں نے ایک بھاری شرارت کی تھی اسی طرح بن یامین کے ساتھ بھی کی۔ چنانچہ جب حضرت یوسف اپنے آپ کو ان پر ظاہر کرتے ہیں تو یوں فرماتے ہیں۔ **هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَ أَخِيهِ** (۸۹) (ترجمہ۔ کیا تم جانتے ہو کہ تم لوگوں نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا؟) اب ظاہر ہے کہ اور کوئی واقعہ بن یامین کے ساتھ ایسا نہیں ہوا جس میں ان کے ساتھ قریباً قریباً ویسا ہی سلوک ہوا ہو جیسا یوسف کے ساتھ ہوا تھا۔ صرف یہی ایک واقعہ ہے اور ان کی شرارت کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ انہوں نے چوری کا جھوٹا الزام یوسف پر بھی لگایا۔ **فَالْأَنْ يَسْرِقُ فَقَدْ سَرَقَ أَخُّهُ لَهُ مِنْ قَبْلٍ** (۷۷)۔ اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے بھائی یوسف نے بھی چوری کی تھی۔ حالانکہ یہ دونوں جھوٹ تھے۔ گویا جبائے صفائی کی شہادت پیش کرنے کے اور چوری کے الزام کی تائید کا مطلب یہی ہوا کہ یہ دونوں بھائی چور ہیں۔ اور حضرت یعقوب سے جب انہوں نے جا کر یہ ذکر کیا کہ تیرے بیٹے نے چوری کی ہے تو انہوں نے اس کا الزام اپنی پرداہی پر سوال لکھ کر اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تمہاری ہی کوئی شرارت ہے۔ پس اصل واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان بھائیوں میں سے کسی نے محض شرارت کے طور پر پیالہ اٹھا کر بن یامین کی بوری میں رکھ دیا تاکہ یوسف کی طرح وہ بھی حضرت یعقوب کی نظر وہی سے دور ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ بابل میں یہی ذکر ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے نوکروں کو پیالہ رکھنے کا حکم دیا تھا۔ مگر بابل نے فتح ترین افعال انبیاء کی طرف منسوب کیے ہیں۔ حضرت لوط کی طرف زنا، وہ بھی بیٹیوں کے ساتھ، حضرت ہارون کی طرف شرک، حضرت سلیمان کی طرف بت پرستی، حضرت داؤد کی طرف زنا۔ اور قرآن کریم نے ایسے تمام ناپاک الزامات سے انبیاء علیہم السلام کی بریت کی ہے اور عصمت انبیاء کا اصول سکھایا ہے۔ اس لئے حضرت یوسف کی طرف ایسا فعل اگر بابل منسوب کر دے تو اس کی معمولی تحریفات میں سے ایک ہے مگر قرآن کریم ایسا نہیں کر سکتا۔” (بیان القرآن۔ فٹ نوٹ ۱۵۲۵)

آگے آیت ۶۷ میں آتا ہے **كَذَلِكَ كَذَنَالِيُوسُفَ**۔ ”اسی طرح ہم نے یوسف کیلئے ارادہ کیا۔“ . **كَذَنَا**۔ کاد۔ بمعنی اراد۔۔۔ ”اللَّهُ تَعَالَى“ فرماتا ہے کہ ہمارا ارادہ یوسف کے لئے ایسا ہی ہوا کہ ان کا بھائی ان کے پاس رہ جائے۔ **كَذَنَا** بمعنی ارادنا ہونا، اس سے بھی ظاہر ہے کہ آگے آتا ہے الا ان یشاء اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت سے ایسا ہوا۔ اور اگر

کدنہ بھعنی تدبیر بھی لیا جائے تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ تدبیر ہم نے یوسف کے لئے کی۔ یہ نہیں فرمایا کہ یوسف نے یہ تدبیر کی۔ اور اس صورت میں کدنہ کے لفظ میں یہ اشارہ ہو گا کہ ان کے بھائیوں کی تدبیر تو یہی کہ بن یا مین کسی طرح واپس حضرت یعقوب کے پاس نہ جائے اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو یوسف کے حق میں کر دیا کہ بھائی بھائی کے پاس رہ گیا۔ وہ خود بغیر انشائے راز کے اسے نہ رکھ سکتے تھے۔ اور اس حقیقت کو وہ ابھی ظاہرنہ کرنا چاہتے تھے۔ مشیت الہی سے یہ ایک سامان پیدا ہو گیا کہ بن یا مین حضرت یوسف کے پاس رہ گئے۔۔۔ اگر یوسف نے خود یہ کام کیا ہوتا تو یہاں نہ رفع درجات من نشاء کا کوئی موقع نہ تھا۔ کیونکہ، ہر حال یہ ایک چال بازی تھی اور چال بازی کے موقع پر رفع درجات موزون نہیں۔ ہاں خود بخود اس سامان کا پیدا ہو جانارفع درجات پر گواہ ہے۔ یعنی جب انسان اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے فائدہ کے سامان خود بخود پیدا کر دیتا ہے۔” (بیان القرآن۔ فٹ نوٹ۔ ۱۵۷۰)

11۔ حضرت سلیمان اور ان کے عصا کو دیک کے کھانے کا قصہ

مفسرین نے یہاں (یعنی سورت سبا 34 آیت 14 کے متعلق) ایک قصہ لکھا ہے کہ حضرت سلیمان کی جب وفات قریب آئی تو انہوں نے دعا کی کہ میری موت کا علم جنوں کو نہ ہو، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جن علم غیب نہیں جانتے جیسا کہ انہیں دعویٰ تھا۔ چنانچہ آپ ایک عصا کا سہارا لئے کھڑے ہوئے حالت عبادت میں فوت ہو گئے اور اسی طرح ایک سال کھڑے رہے یہاں تک کہ دیک نے عصا کو کھالیا۔ تب آپ گر پڑے اس قصہ کی کوئی اصلاحیت تو ریت میں نہیں ہے اور گوابن جریئے اسے حدیث مرفوع کے طور پر بیان کیا ہے۔ مگر ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس کی صحت میں نظر ہے اور اسے غریب اور منکر کہا ہے۔ اور جنوں کو تو علم غیب کا دعویٰ تھا مگر کیا اس زمانہ میں انسانوں کو بھی سمجھ نہ آتا تھا کہ حضرت سلیمان نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ نہ پیشاب یا پاخانہ کے محتاج ہیں۔ پھر اس عرصہ میں امورِ مملکت کس طرح طے پاتے تھے؟ حضرت سلیمان بادشاہ تھے

اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت ان پر فرض تھی امور سلطنت کو سرانجام دینا بھی ان کے ذمہ تھا۔ پھر عصا کے سہارے سے لاش کا کھڑا رہنا بھی قیاس میں نہیں آ سکتا سوائے اسکے کہ اسے بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی نعش مبارک کا ایک مجرہ بنالیا جائے، اور ایک نبی کی لاش کی یہ بے حرمتی ہے کہ ایک سال تک وہ دفن بھی نہ ہو۔ اور بظاہر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس مضمون کا یہاں کیا تعلق ہے اگر ایسا ہوا بھی تو اس کو اس موقع پر بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ حضرت سلیمان پر اپنی نعمتوں کے ذکر کے بعد بتانا تو یہ چاہئے تھا جیسا آگے سبا کے ذکر میں بتایا ہے کہ جب پچھلے لوگوں نے ناشکری کو تو اللہ تعالیٰ نے وہ نعمتیں چھین لیں۔ جن غیب جانتے تھے یا نہ جانتے تھے۔ اس کا یہاں کیا تعلق ہے اور جنوں کے سلیمان کے ماتحت ہوتے ہوئے کون خیال کر سکتا تھا کہ جن علم غیب جانتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت سلیمان کی وفات کے بعد ہی بعد اس سلطنت کی حالت خراب ہو گئی۔ حضرت سلیمان کے میٹے رجعام کے تخت نشین ہونے کے تھوڑی دیر بعد یہ بعام کی انگیخت پر بنی اسرائیل نے کچھ مطالبات پیش کیے اس وقت حضرت سلیمان کے پرانے مشیروں نے رجعام کو یہ مشورہ دیا کہ وہ قوم کو تنگ نہ کرے اور ان کے مطالبات کو قبول کرے مگر اس نے بجائے ان مشیروں کی بات سننے کے اپنے نوجوان ساتھیوں کے کہنے پر بنی اسرائیل کے مطالبات کا سخت جواب دیا اور ان پر سخت کرنے کی ٹھانی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس قویں باغی ہو گئیں اور حضرت سلیمان کی سلطنت بر باد ہو گئی اور رجعام کی حکومت صرف ایک چھوٹی سی شاخ پر رہ گئی (اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ غیر اسرائیلی قویں بھی آزاد ہو گئیں) دیکھو سلاطین باب 12۔ پس دابة الارض یہی رجعام حضرت سلیمان کا بیٹا ہے جس کی نظر صرف زمین تک مدد و تھی اور سلیمان کے عصا کا کھایا جانا اس کی سلطنت کی بربادی ہے۔ اور جن سے مراد غیر قویں ہیں جنہوں نے اب تک بنی اسرائیل کی ماتحتی کا جواہٹھایا ہوا تھا۔ (بیان القرآن۔ فٹ نوٹ ۲۶۸۵)

(نوت) بالکل یہی بات علامہ رحمت اللہ طارق نے ”برہان القرآن“ میں لکھی ہے۔ (خورشید)

12۔ آیت خاتم النبیین اور اُس کی تشریح

خاتم النبیین (40:33)۔ انبیاء علیہم السلام ایک قوم ہیں اور کسی قوم کا خاتم یا خاتم ہونا صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے یعنی ان میں سے آخری ہونا۔ پس نبیوں کے خاتم کے معنی نبیوں کی مہر نہیں بلکہ آخری نبی ہیں۔ یہاں ان سب احادیث کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں جن میں خاتم النبیین کی تشریح کی گئی ہے۔ یا جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی کا نام آنایا کیا گیا ہے، اور یہ احادیث متواترہ ہیں جو صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے مردی ہیں، اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی نہیں۔ حدیث اول جس میں لفظ خاتم النبیین کی تفسیر زبان نبوی سے مردی ہے متفق علیہ ہے مثلاً ومثل الانبیاء کمثل رجل بنی بیتا فاحسنہ واجملہ الاموضع لبنة من زاوية فجعل الناس يطوفون به ويتعجبون له ويقولون هلا وضع هذه اللبنة قال فانا اللبنة وانا خاتم النبیین یعنی میری مثل اور نبیوں کی مثل ایک شخص کی مثل ہے جس نے ایک گھر بنایا اور اسے اچھا اور خوبصورت بنایا سوائے کونے کی اینٹ کے تو لوگ اس کے گرد گھومتے اور تجھ کرتے اور کہتے یہ اینٹ کیوں نہیں لگائی سویں وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔ اور دوسری حدیث متفق علیہ میں لفظ خاتم النبیین کی تفسیر یوں کی ہے۔ انه سیکون فی امتی ثلثون کذاباً کلهم بزعم انه نبی وانا خاتم النبیین لانی بعدی یعنی امت میں کذاب ہوں گے۔ ہر ایک ان میں سے دعویٰ کے گا کہ وہ نبی ہے اور میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور تیسرا حدیث میں جو مسلم ترمذی نسائی کی ہے یہ ذکر ہے کہ مجھے چھ چیزوں میں دوسرے انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے جن میں چھٹی یہ ہے کہ ختم بی النبیوں یعنی میرے ساتھ نبی ختم کیے گئے ہیں۔ وہاں بجائے خاتم النبیین کے یہ لفظ رکھ کر بتادیا کہ خاتم النبیین سے یہی مراد ہے نہ کچھ اور وہ احادیث جن میں آپ کے آخری نبی ہونے کا ذکر ہے اور وہ بھی درحقیقت خاتم النبیین کی تفسیر ہی ہیں، بہت سی ہیں مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ بنی اسرائیل میں نبی کے بعد نبی آتا تھا لیکن میرے بعد نبی نہ

آئے گا بلکہ خلفاء ہوں گے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا۔ اور ایک میں ہے کہ علیؑ کی نسبت میرے ساتھ وہی ہے جو ہارونؑ کی موسیٰؑ کے ساتھ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں، اور ایک میں ہے کہ میرا نام عاقب ہے اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہوانا العاقب والعاقب الذی لیس بعد ه نبی۔ اور ایک میں ہے کہ نبوت میں سے کچھ باقی نہیں رہا مگر ببشرات، اور ایک میں ہے کہ نبوت اور رسالت منقطع ہو گئی اور دس حدیثوں میں ہے لانبی بعدی یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں اور ایسی حدیثیں جن میں آپؐ کو آخری نبی کہا گیا ہے چھ ہیں۔ اس قدر زبردست شہادت کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان کا آخر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے سے انکار کرنا پینات اور اصول و نبی سے انکار ہے۔

لوعاش ابراہیم لکان نبیا پر بحث

اور اس کے خلاف جو کچھ احادیث میں سمجھا گیا ہے وہ ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے لوعاش ابراہیم لکان نبیا۔ مگر اول اس سے امکان نبوت نہیں لکھتا بلکہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے لو کان فیهمما الله الا الله لفسدنا جس طرح یہاں دو خداوں کا ہونا اور فساد دونوں ممتنع امر ہیں۔ اسی طرح وہاں ابراہیم کا زندہ رہنا اور اس کا نبی ہونا دونوں ممتنع امر ہیں۔ دوسرے اس حدیث کی سند میں ضعف ہے کیونکہ اس میں ابو شيبة ابراہیم ہے جسے ضعیف کہا گیا ہے۔ تیسرا اس کی تشریع دوسرے اقوال سے ہوتی ہے۔ مثلاً بخاری میں عبد اللہ بن ابی اوفر کا قول لوقضی بعد محمد صلعم نبی عاش ابنه ابراہیم ولکن لانبی بعدہ یعنی اگر آخر حضرت صلی اللہ کے بعد کوئی نبی مقدر ہوتا تو آپؐ کا بیٹا ابراہیم زندہ رہتا لیکن آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں یا انس کا قول ولو بقی لکان نبیا لکن لم یبق لان نبیکم آخر الانبیاء یعنی اگر ابراہیم زندہ رہتا تو نبی ہوتا لیکن وہ باقی نہیں رہا کیونکہ تمہارے نبی آخری نبی ہیں۔

حضرت عائشہؓ کا قول

جس کی سند کوئی نہیں قُولُوا خَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَلَا تَقُولُوا لَانَّبَيِّ بَعْدَهُ . خَاتَمَ النَّبِيِّينَ کہ اور یہ نہ کہو کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ صدیقہ

کے نزدیک خَاتَمُ النَّبِيِّينَ کے معنی کچھ اور تھے۔ کاش وہ معنی بھی کہیں مذکور ہوتے۔ حضرت عائشہؓ کے اپنے قول میں ہوتے، کسی صحابی کے قول میں ہوتے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہوتے۔ مگر وہ معنی دولٹن قائل ہیں اور اس قدر حدیثوں کی شہادت جن میں خَاتَمُ النَّبِيِّينَ کے معنی لانبی بعدی کیے گئے ہیں ایک بے سند قول پر پہلی پشت ہیچکی جاتی ہیں۔ یہ غرض پرستی ہے خدا پرستی نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیس حدیثوں کی شہادت ایک بے سند قول کے سامنے رکی جاتی ہے۔ اگر اس قول کو صحیح مانا جائے تو کیوں اس کے معنی یہ نہ کیے جائیں کہ حضرت عائشہؓ کا مطلب یہ تھا کہ دونوں باتیں اکٹھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ خَاتَمُ النَّبِيِّينَ کافی ہے۔ جیسا کہ مغیرہ بن شعبہ کا قول ہے کہ ایک شخص نے آپ کے سامنے کہا خَاتَمُ الْأَنْبِيَاءَ وَلَا نَبِيٌّ بَعْدَهُ تو آپ نے کہا خَاتَمُ الْأَنْبِيَاءَ کہنا تجھے بس ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کا مطلب ہو کہ جب اصل الفاظ خَاتَمُ النَّبِيِّينَ واضح ہیں تو وہی استعمال کرو یعنی الفاظ قرآنی کو الفاظ حدیث پر ترجیح دو۔ اس سے یہ کہاں لکلا کہ آپ الفاظ حدیث کو صحیح نہ سمجھتی تھیں۔ اور اتنی حدیثوں کے مقابل اگر ایک حدیث ہوتی تو وہ بھی قابل قبول نہ ہوتی، چہ جائے کہ صحابی کا قول جو شرعاً جلت نہیں۔

ختم نبوت اور نزول عیسیٰ

اور یہ خیال جلوگوں میں پایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نبی اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد واپس آئیں گے یہ بھی اس نص صریح کے خلاف ہے۔ حضرت عیسیٰ ایک روشن چراغ تھے جنہوں نے ایک ضرورت کے وقت صرف بنی اسرائیل کے ایک گھرانے کو روشن کیا۔ ورسولاً الی بنی اسرائیل (آل عمران: ۳۹) محدث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب عالمتاب ہیں۔ وسراجا منیراً۔ (الاحزاب: ۳۳) آفتاب کے نکل آنے کے بعد چراغ روشن نہیں ہوا کرتے۔ یہ فعل تو انسان بھی نہیں کرتا خدا یہ حکیم کی طرف کیونکہ منسوب ہو سکتا ہے۔ پھر اگر حضرت عیسیٰ آجائیں تو ختم نبوت باطل ہوئی۔ کیوں کہ نبی نبوت سے معزول نہیں ہو سکتا۔ جب حضرت عیسیٰ آئیں گے نبی ہو کر ہی آئیں گے۔ اور یہ کہنا کہ نبی تو ہوں گے مگر کام نبوت کا نہیں کریں گے اور بھی عجیب بات ہے۔ وہ خدا بھی عجیب ہے کہ ایک نبی کو بھیجا ہے مگر کام نبوت کا اس

سے کچھ نہیں لیتا۔ اور پھر عملاً یہ عہدہ نبوت سے معزولی ہے۔ سوال صاف ہے اگر ختم نبوت ایک فرضی شے ہے تو چاہے ہزاروں نبی آئیں اور اگر یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی نہیں رہا اور تجھیں کو پہنچ گیا، تو جیسے نیابی نہیں آسکتا پرانا بھی نہیں آسکتا۔ اور احادیث میں جو عیسیٰ ابن مریم کے آنے کا ذکر ہے تو اس سے مراد سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ ایک عیسیٰ صفت انسان اس امت میں بھی پیدا ہوگا۔ اور انہی حالات کے ماتحت حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل میں آئے تھے۔ (۱)

مومنوں کے لئے روحانی بآپ

اس آیت کا یہاں کیا تعلق ہے؟ اصل مضمون تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ہوتا تھا، اور یہ کہ مومنوں کا تعلق آپ سے روحانی تعلق ہے اور آپ مومنوں کے لئے روحانی طور پر بآپ ہیں۔ اسی مضمون کو یہاں ادا کیا ہے اور بتایا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے بآپ نہیں لیکن چونکہ اس سے جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی ابوت کی نفی کا اشتباہ پیدا ہوتا تھا اس لئے حرف استدرآک لکن سے فی الغور اس کا ازالہ کیا اور فرمایا رسول اللہ، وہ اللہ کے رسول ہیں یعنی روحانی طور پر تمہارے بآپ ہیں۔ کیونکہ ہر ایک رسول اپنی امت کے حق میں روحانی طور پر بآپ کا حکم رکھتا ہے۔ جس طرح جسم کی ابتداء بآپ سے ہوتی ہے روحانیت کی ابتداء رسول سے ہوتی ہے۔ پس رسول اللہ کا الفاظ لکرا کر آپ کی ابوت روحانی کو قائم کیا۔ لیکن یہاں پھر ایک وہم پیدا ہوتا تھا کہ جس طرح پہلے رسولوں کے بعد وسرے رسول آجاتے رہے تو رسولوں کی ابوت روحانی منقطع ہو جاتی رہی، کیا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو گا تو فرمایا ایسا نہیں

(۱) اس تشریح کو مولانا وحید الدین خان نے بھی تسلیم کیا ہے۔ احمد یوں کی طرح اب وہ بھی یہ مانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ دیگر انبیاء کرام کی طرح وفات پاچکے ہیں۔ اور اس بات کو مصر حاضر کے بیہیوں نامور غیر احمدی مفسر، مفکر اور عالم بھی مان پچکے ہیں۔ پس ایسے میں مسلمانوں کے لئے دو ہی راستے کھلے ہیں : ایک یہ کہ ان ڈھیر ساری احادیث صحیح کا سرے سے ہی انکار کر دیں جن میں مسیح کے دوبارہ آنے کا ذکر ہے۔ لیکن یہ تجھ درست نہ ہوگی۔ کیونکہ اس سے احادیث پر سے ہی اعتبار اٹھ جائے گا۔ اس لئے لازماً یہی مانتا پڑے گا کہ کوئی اللہ کا بندہ ایسا ظاہر ہو گا جو حضرت عیسیٰ کا رسول ماؤں ہو گا۔ یعنی مثل مسیح بن کرائے گا۔ (دیکھو الرسالہ۔ متی ۲۰۱۰ء)۔ خوشید

ہوگا۔ بلکہ آپ خَاتَمُ النَّبِيِّينَ بھی ہیں یعنی آخری نبی اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ اس لئے آپ کی ابتو روحاں کا سلسلہ بھی تاقیامت منقطع نہ ہوگا، بلکہ جو فیض ملے گا وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی ملے گا۔ اور اسی فیض کے پانے سے ہی آپ کی امت کے لوگ مثیل انبیاء ہوں گے۔ علماء امتی کا نبیاء نبی اسرائیل۔ وہ نبی نہ ہوں گے پر نبیوں کی طرح ہوں گے۔ وہ نبی نہ ہوں گے پر اللہ تعالیٰ ان سے ہم کلام ہوگا۔ رجال یکلمون من غیر ان یکونوں انبیاء اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام معطل نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے کمال علم کی دلیل ہے کہ تمام دنیا کی ضروریات مذہبی کے متعلق مکمل ہدایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمادیں۔ اسی لئے آیت کا خاتمه بكل شئی علیما پر کیا ہے۔ ہدایات دینی مکمل ہو گئیں لیکن تعلق باللہ ختم نہیں ہوا بلکہ ان ہدایات کی بدولت پہلے سے بھی بڑھ کر حاصل ہوتا ہے۔

13- سورة الاخلاص

توحید کی جامع تعلیم اور شرک کی کامل تردید

فُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ (۱) اللَّهُ الصَّمَدُ (۲) لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ (۳) وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُواً أَحَدٌ (۴) ترجمہ۔ کہہ اللہ (تعالیٰ) ایک ہے۔ اللہ (تعالیٰ) بے نیاز ہے۔
ناس کا کوئی میٹا ہے نہ وہ کسی کا بیٹا ہے۔ اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

”۔۔۔ اس چھوٹی سی سورت میں وحدانیت باری تعالیٰ کے سارے پہلوؤں کو شامل کیا ہے اور ہر قسم کے شرک کا ابطال کیا ہے۔ پہلی آیت میں اس کا احمد ہونا بیان کیا ہے یعنی وہ اپنی ذات میں اکیلا ہے اور یوں ہر قسم کی شرک فی الذات اور تثنیت وغیرہ کی تردید کی ہے۔ دوسری آیت میں اس کا صمد ہونا بیان کیا ہے۔ یعنی وہ جس نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اور اس لئے سب چیزیں اس کی محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اس میں اس غلط خیال کی بھی تردید ہے کہ مادہ اور روح کو اللہ تعالیٰ نے پیدا نہیں کیا بلکہ وہ خود بخود ہیں۔ اگر ایسا ہوتا پھر اللہ تعالیٰ صمد نہیں

ہو سکتا۔ کیونکہ وہ مادہ اور روح کا محتاج ہوا اور مادہ اور روح اس کے محتاج نہ ہوئے۔ ایسا ہی بت پرست قوموں کے اس عقیدہ کی بھی تردید ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لئے بتوں کی ضرورت ہے مانعِ جذبہمُ إلَّا لِيُقْرِبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفِی (الزمر-31)۔ تیسری آیت میں خدا کے باپ یا بیٹا ہونے کی تردید ہے اور یہ نصاری کا عقیدہ ہے۔ چوچی میں اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر ہونے کی تردید ہے جیسے اوتار مانے والوں کا عقیدہ ہے یا جیسے آتش پرستوں کا عقیدہ ہے کہ خالق خیر خدا کے مقابلہ پر ایک خالق شر ہے۔

پھر ایک اور پہلو سے ہر قسم کے شرک کی یہاں نفی کی ہے کیونکہ شرک یا ذات میں ہو گا جس کی تردید احمد میں ہے۔ یا صفات میں ہو گا جس کی تردید صمد میں ہے۔ یا بحاظ ولد یا والد ہونے کے ہو گا جس کی تردید لم یلد ولم یولد میں کی ہے۔ اور یا افعال میں ہو گا یعنی اس جیسا فعل کوئی دوسرا بھی کر سکتا ہے۔ جس کی تردید لم یکن لہ کفواً احمد میں کی ہے۔ یوں تمام پہلوؤں سے اس آخری سورت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کو مکال کے رنگ میں بیان کیا ہے اور ہر قسم کے شرک کی جڑ کاٹی ہے۔ (بیان القرآن۔ فٹ نوٹ ۳۶۶۳)

تمت بالخیر۔ ﴿تَرِينَ مَنْزِلَ لِدِصِيَانَهُ۔ ۱۲ فِرْدُوْرِی ۲۰۱۵﴾

سینیوں (پارہ ۲) شورہُ الْبَقَرَةِ (۲) بیان القرآن 230

مَوْلُودُ لَهُ بِوَلَدَةٍ وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلٌ
دی جائے اور نہ باپ کو اپنے پیچے کی وجہ سے اور وارث پر بھی ایسی ہی (ذمہ داری) ہے۔ پھر اگر وہ دونوں آہنسی کی رضامندی اور مشترکے سے دو دھچڑاں پایں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔ (۳۰۲) اور اگر تم جانتے ہو کہ اپنی اولاد کے لیے (اور) دو دھچڑے پانے والی کھلتوں تم پر کوئی گناہ نہیں بشریکہ جو تم نے دینا تھا عمدگی سے پردادے دو اور اللہ کا تقویٰ کرو اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔

بِمَا نَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ④

تین طاقوں کا حدم جواز:

بیان سے بھی معلوم ہوا کہ اکٹھی تین طاقیں ناجائز ہیں کیونکہ طلاق کے بعد جو میاں نبی نبی کو پھر دوبارہ نکاح کر لیں کی اجازت اس آیت سے ملتی ہے وہ اکٹھی تین طاقوں سے باللہ ہو جاتی ہے اور اس کو جائز کی اور اکٹھی پہاڑی کی خار ہے کیونکہ اس کے خلاف کر کے طالع کا گند قبول کرنے پڑا۔

167

